سندھ کی کہانی:
مٹی، مزاحمت اور محبت

رک سندھی

کراچی 2025

The Story of Sindh: Soil, Resistance and Love

Author: Ruk Sindhi

Karachi 2025

Book in Urdu Language

فہرست

1. روپا ماڑی : محبت، بہادری اور قربانی کا امر استعارہ
2. پاکستان کی تہذیبی بنیاد : سندھ وادی کی شناخت
3. جب افغان حکمران نے سندھ کے وزیرِاعظم کو اغوا کر لیا
4. سندھ پر ارغونوں کی حکومت: تاریخ، مزاحمت اور ثقافتی بیگانگی

5. ہالانی کی جنگ: کلہوڑوں سے تالپوروں تک حکومتی تبدیلی کا تاریخی احوال
6. تھر میں سوڈھا اور کولہی مزاحمت: برطانوی سامراج کے خلاف 16 سالہ جدوجہد
7. خاصائی کی جنگ: سندھ کے سورماؤں کی مزاحمت کی داستان
8. ارغونوں کے حملے اور ملتان کا المیہ: جب لوگ کتے اور بلیاں کھانے پر مجبور ہوئے
9. جب سکندرِ اعظم نے ماچھی قبیلے کے جنگجو بادشاہ کو اروڑ میں پھانسی دی
10. راجپوت نسل سے سندھ کی جدید ذاتوں کا ارتقاء

11. سندھ کی ذاتوں، قبائل اور قومی شناخت کا تحقیقی جائزہ
12. سندھ پر رائے خاندان کی حکومت: ایک مثالی دور کی کہانی
13. سندھ کے قبائل اور شاہ بیگ ارغون کے خلاف مزاحمت
14. سندھ رانی اور میر باگو خان تالپور:اقتدار، محبت اور قربانی کی انوکھی داستان
15. جب ارغون حکمران کے دو بھائی سندھ کے ہاتھوں مارے گئے
16. راجا پورس نے سکندر مقدونی کو سندھ سے کس طرح پسپا ہونے پر مجبور کیا؟
17. پانی کا ہتھیار: دریائے سندھ پر سیاسی انتقام یا تہذیبی قتل؟

18. موریا خاندان اور سندھ — تاریخ، ثقافت اور بدھ مت کے اثرات
19. جھم کا شوَ مندر — ایک تاریخی و ثقافتی جائزہ
20. سندھ میں تمر کے جنگلات — حیاتیاتی اور سماجی و معاشی اہمیت
21. صاحب محل — ایک تعمیری اور تاریخی جائزہ
22. غزالہ رفیق — ریڈیو، ٹی وی، فلم اور اسٹیج کی نامور فنکارہ
23. پَبّ پہاڑ: تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی جائزہ
24. پتڻ منارو — قدیم سندھ کا تاریخی مقام
25. روھل جی کنڈ — سندھُو تہذیب کا ایک اہم مقام

26. تیرتھ دھارا — ایک علمی جائزہ
27. علاءالدین خلجی کے سندھ پر حملے کا دعویٰ: تاریخی حقیقت اور لوک شعور کا تجزیہ

روپا ماڑی : محبت، بہادری اور قربانی کا امر استعارہ

رک سندھی

سندھ کے دریائی کناروں، ریت کے ٹیلوں اور تاریخ کے اوراق میں ایسے بھی مقامات ہیں جو محض پتھروں، اینٹوں یا دیواروں کے ڈھانچے نہیں، بلکہ محبت، وفاداری، بہادری اور قربانی کی لازوال یادگار ہیں۔ انہی مقامات میں ایک ہے **روپا ماڑی** — جو ایک بادشاہ کی محبت کا تحفہ تھی، لیکن وقت کی دھول میں یہ قربانی اور عزم کی علامت بن گئی۔

بدین شہر سے جنوب کی طرف تقریباً 26 میل کے فاصلے پر، سومرا دور کے طاقتور حکمران بھونگر بادشاہ نے اپنی محبوب بیوی **روپا رانی** کے لیے کُنر سر کے کنارے ایک شاندار ماڑی تعمیر کروائی۔ ملکہ کے نام سے منسوب یہ عمارت "روپا ماڑی" کہلائی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بادشاہ سلطنت کے اہم فیصلے کرتا، تاجپوشی کی تقاریب منعقد ہوتیں اور جہاں سندھ کا دارالحکومت بھی منتقل ہوا۔

بھونگر بادشاہ کے انتقال (1288ء) کے بعد اس کا بیٹا **چنسر** تخت نشین ہوا، جبکہ وگھے کوٹ پر اس کا وفادار بھائی **دودو سومرو** حکمرانی کرتا رہا۔ سیاسی اختلافات اور اقتدار کی کشمکش کے باوجود روپا ماڑی حکمرانی اور شان و شوکت کا مرکز بنی رہی،

یہاں تک کہ تاریخ نے ایک ایسا موڑ لیا جہاں محبت اور وطن پرستی دونوں کو قربانی کے امتحان سے گزرنا پڑا۔

1299ء میں مغل فوج نے دو طرف سے سندھ پر چڑھائی کی— ایک لشکر بکھر سے اور دوسرا ننگرپارکر سے۔ سندھ کے بہادر سپاہی چھوٹے چھوٹے دستوں میں دشمن کو روکنے کے لیے ڈٹے رہے، مگر دشمن کی کثرت اور طاقت کے آگے مزاحمت بتدریج پسپا ہونے لگی۔ ایسے میں کئی سردار اپنے خاندان اور قیمتی سامان کو کچھ کی طرف روانہ کر گئے، مگر **روپا رانی** نے جانے سے انکار کر دیا۔

دودو سومرو، جس پر ملکہ کی حفاظت کی ذمہ داری تھی، روپا ماڑی کو چھوڑنے کے بجائے آخری سانس تک میدانِ جنگ میں لڑتا

رہا۔ 1300ء میں، جب دشمن لشکر ماڑی کے دروازے تک پہنچ گیا، دودو زنانی در کے قریب لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ بھائی کا خون میں ڈوبا جسم دیکھ کر چنسر کے خون میں بھی جوش آیا اور وہ بھی جنگ میں شامل ہو کر شہید ہو گیا۔

دودو کی شہادت کے بعد روپا رانی نے اپنا فیصلہ کر لیا — اس نے خود کو آگ کے حوالے کر دیا اور ماڑی کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئی، مگر دشمن کے ہاتھ نہ آئی۔ آج بھی روپا ماڑی کے قریب دودو کی قبر موجود ہے، جبکہ روپا رانی کا مزار کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

روپا ماڑی 640ھ میں تعمیر ہوئی اور 700ھ میں تباہ ہو گئی، مگر اس کے پتھر، اس کی دیواریں اور اس سے جڑی روایات آج بھی

سندھ کی تاریخ میں محبت اور وطن کے لیے جان قربان کرنے کا استعارہ بنی ہوئی ہیں۔ ہر سال 14 پھگن (فروری کے پہلے ہفتے) یہاں میلہ لگتا ہے، جہاں شہیدوں کی یاد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں — تاکہ تاریخ کو زندہ رکھنے کا فرض نبھایا جا سکے۔

روپا ماڑی صرف ایک محل نہیں تھی، یہ ایک داستان تھی — محبت کی، بہادری کی، اور اس عہد کی کہ وطن اور عزت کے لیے آخری سانس تک جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔

پاکستان کی تہذیبی بنیاد : سندھ وادی کی شناخت

رک سندھی

آج ہم جس سرزمین پر کھڑے ہیں، وہ محض ایک سیاسی ریاست نہیں، بلکہ ایک تہذیبی ورثے کی امین ہے۔ پاکستان کی اصل شناخت، اس کی روح، اس کی بنیاد — سندھ وادی کی تہذیب ہے۔ یہ وہ تہذیب ہے جو دنیا کی قدیم ترین شہری تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے، اور جس نے انسانیت کو علم، فن، تعمیر، اور وحدت کا پیغام دیا۔

تاریخی پس منظر:
پاکستان کی تاریخ کا آغاز 1947 سے نہیں ہوتا۔ یہ تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے، جب موئن جو دڑو، ہڑپہ، اور دیگر عظیم شہر علم و فن کے مرکز تھے۔ یہ وہ وقت تھا

جب سندھ وادی میں انسان نے پہلی بار شہری زندگی، تحریر، اور منصوبہ بندی کا آغاز کیا۔ سندھ کی سرحدیں اُس وقت موجودہ پاکستان سے کہیں زیادہ وسیع تھیں — پنجاب، خیبر پختونخوا، بلوچستان، کَچھ، کاٹھیاواڑ، گجرات، اور راجستھان — یہ سب کبھی سندھ کے تہذیبی دائرے میں شامل تھے۔

تہذیبی وراثت اور مقامی شناخت:

سندھ وادی کروڑوں سال سے سندھی بولنے والوں کا وطن رہی ہے۔ یہ لوگ کہیں باہر سے ہجرت کرکے نہیں آئے، بلکہ اسی دھرتی پر پیدا ہوئے، یہیں پروان چڑھے، اور یہی ان کی پہچان ہے۔ یہی مقامی لوگ، یہی تہذیب کے وارث، آج پاکستان کی سرحدوں کے اندر بستے ہیں — بغیر کسی

نسلی یا لسانی فرق کہے ان کی شناخت مشترکہ ہے، ان کی ثقافت ایک ہے، اور ان کا ورثہ سندھ وادی کی تہذیب ہے۔

قومی وحدت کا پیغام:
کشمیر سے کراچی تک، ایک ہی تہذیب کی خوشبو ہے۔ ایک ہی ثقافت کی روشنی ہے۔ ایک ہی قومی شناخت کی گونج ہے۔ پاکستان کے اصل وارث وہی لوگ ہیں جو صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔ جنہوں نے اس دھرتی کو سنوارا، اس کی زبانوں کو پروان چڑھایا، اور اس کی تہذیب کو زندہ رکھا۔

اختتام (دعوتِ فکر)
آج وقت ہے کہ ہم اپنی شناخت کو صرف سیاسی یا مذہبی بنیادوں پر نہ دیکھیں، بلکہ تہذیبی اور تاریخی بنیادوں پر سمجھیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم سندھ وادی کی تہذیب کو پاکستان کی بنیاد مانیں — کیونکہ یہی وہ بنیاد ہے جو ہمیں جوڑتی ہے، ہمیں متحد کرتی ہے، اور ہمیں دنیا کے سامنے ایک قدیم، باشعور، اور باوقار قوم کے طور پر پیش کرتی ہے۔

جب افغان حکمران نے سندھ کے وزیرِاعظم کو اغوا کر لیا

رُک سندھی

انیسویں صدی کا ابتدائی نصف، برصغیر اور وسطی ایشیا کی سیاست میں ایک ہلچل انگیز دور تھا۔ سلطنتوں کے زوال اور نئے اقتدار کے ابھرنے کے بیچ، سندھ کی سرزمین بھی بڑی طاقتوں کے تصادم کی زد میں رہی۔ انہی طوفانی برسوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سندھ کے سیاسی افق کو ہلا کر رکھ دیا — افغان حکمران شاہ شجاع درّانی کا سندھ کے وزیرِاعظم کو اغوا کر لینا۔

شاہ شجاع: عروج، زوال اور لالچ

شاہ شجاع درّانی، احمد شاہ ابدالی کا پوتا، 4 نومبر 1785ء کو پیدا ہوا۔ وہ پہلی بار 1803ء سے 1809ء تک اور دوسری بار 1839ء سے 1842ء تک افغانستان کی

تخت نشینی پر فائز رہا۔ مگر ان دونوں ادوار کے بیچ وہ ایک بے تاج بادشاہ کے طور پر دربدر پھرتا رہا، اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیافت کے لیے جہاں ممکن ہوا، اپنی عسکری اور سیاسی چالیں آزما کر دیکھتا رہا۔ سندھ، خصوصاً تجارتی شہر شِکارپور، اُس کی نظر میں ہمیشہ ایک پرکشش ہدف رہا۔

شِکارپور پر پنجہ آزمائی

کَلھوڑوں کے زوال اور ٹالپُر میروں کے عروج کے ساتھ ہی افغان پٹھانوں نے شِکارپور پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ یہ شہر اُس دور میں خطے کی معیشت کا سنگم تھا، جہاں سے تجارتی قافلے وسطی ایشیا تک رسائی رکھتے تھے۔ شاہ شجاع کے لیے شِکارپور نہ صرف دولت کا خزانہ تھا بلکہ سندھ میں

سیاسی اثر و رسوخ بڑھانے کا بہترین اڈہ بھی ہے

1806ء میں شاہ شجاع پہلی مرتبہ شِکارپور آیا اور ’باغِ شہزادہ‘ میں قیام کیا۔ میر حکمرانوں نے سفارتی نزاکت کے تحت اُس کی میزبانی میں کوئی کمی نہ چھوڑی، مگر یہ میزبانی بھاری قیمت پر ہوئی۔ ایک روایت میں بیس لاکھ روپے، اور دوسری میں دس لاکھ روپے بطور خراج ادا کیے جانے کا ذکر ملتا ہے۔

ظلم و جبر کی حکایت

شاہ شجاع کا شِکارپور میں قیام مقامی آبادی کے لیے ابتلا کا زمانہ ثابت ہوا۔ منشی عطا محمد کے الفاظ میں:

"جہاں اسے کسی مالدار کا پتا چلتا، وہ پروانے کی طرح جا پہنچتا

اور دولت چھین لیتا۔ جہاں کسی دوشیزہ کا ذکر سنتا، اُسے زبردستی قیدِ حرم میں لے آتا۔"

عورتوں کی عصمت دری، دولت کی لوٹ مار، اور مخالفین پر ظلم — یہ سب اُس کے معمولات کا حصہ تھے۔ حتیٰ کہ اُس نے بعض مواقع پر بااثر مقامی سرداروں کی بیٹیوں کو بھی زبردستی نکاح میں لے لیا۔

وزیرِاعظم کا اغوا — ایک سیاسی دھچکا

1810ء میں جب میروں نے خراج دینا بند کر دیا، شاہ شجاع نے ایک بار پھر شِکارپور پر لشکر کشی کی۔ اس مرتبہ اُس نے سندھ کے وزیرِاعظم نواب ولی محمد خان لغاری کو گرفتار کر لیا۔ یہ اقدام محض عسکری نہیں بلکہ ایک

واضح سیاسی پیغام بھی تھا — کہ افغان طاقت ابھی خطے میں اثر انداز ہو سکتی ہے۔

میروں کے لیے یہ صورتحال ناقابلِ برداشت تھی۔ مذاکرات کا دروازہ کھولا گیا، اور بھاری تحائف کے ساتھ ساتھ بیس لاکھ روپے بطور بھتہ ادا کرنے پر وزیرِاعظم کی رہائی ممکن ہوئی۔ شاہ شجاع اس کے بعد کابل واپس لوٹ گیا، مگر سندھ کے حکمرانوں پر اپنی عسکری اور نفسیاتی برتری کا تاثر چھوڑ گیا۔

طویل سایہ اور انجام

اگلے کئی برسوں تک شاہ شجاع کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ سندھ کی سیاست میں مداخلت کرتا رہا۔ اُس کے حملے، خراج کی طلب، اور لوٹ مار نہ

سندھ کے امن و امان کو بار بار تہ و بالا کیا۔ آخرکار 1842ء میں اُس کا قتل ہوا، لیکن تقریباً چالیس برس تک وہ اس خطے کے لیے ایک مستقل خطرہ اور سیاسی وبال بنا رہا۔

نتیجہ

شاہ شجاع کی کہانی صرف ایک شخص کی لالچ اور جبر کی داستان نہیں بلکہ اس بات کا عبرتناک سبق بھی ہے کہ داخلی کمزوری، حکمرانوں کے باہمی اختلافات، اور سفارتی کم تدبیری، ہمیشہ بیرونی طاقتوں کو مداخلت کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ سندھ کی اُس وقت کی قیادت اگر یکجہتی اور تدبیر سے کام لیتی تو شاید افغان مداخلت کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہوتا۔

سندھ پر ارغونوں کی حکومت: تاریخ، مزاحمت اور ثقافتی بیگانگی

رُک سندھی

تمہید

سندھ کی تاریخ میں کئی ادوار ایسے آئے جنہوں نے اس خطے کی تہذیب، ثقافت اور سیاسی خودمختاری کو شدید متاثر کیا۔ ان

میں ارغون، ترخان اور مغل دور خاص طور پر اہم ہیں، جن کی حکمرانی مختصر رہی مگر اثرات دیرپا۔ سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ان ادوار کی بیگانگی، ظلم اور ثقافتی جبر کو علامتی انداز میں بیان کیا۔ ان کا ایک شعر سندھ کے اجتماعی درد کی ترجمانی کرتا ہے:

"پَیم پٹھانوں سے، بولی کی نہ بُجھیں
میں سندھی کا سعی کروں، وہ فارسیوں پوچھیں
میں بھی ملا تن، سرتیوں سور پرائیو"

یہ شعر ان غیر ملکی حکمرانوں کے رویے پر تنقید ہے جو سندھ پر قابض تو ہوئے، مگر نہ سندھی زبان کو سمجھا، نہ سندھی عوام کے جذبات و ثقافت کو۔ شاہ

لطیف نے اس شعر میں سندھ کے عوامی درد، ثقافتی بیگانگی اور غلامی کے احساس کو علامتی انداز میں بیان کیا۔

ارغون خاندان کا تاریخی پس منظر

ارغون خاندان کا نسب چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔ ذوالنون بیگ ارغون، سلطان حسین بایقرا کی طرف سے قندھار کا حاکم تھا۔ جب شایبانی خان کے ساتھ جنگ میں ذوالنون مارا گیا، تو اس کا بیٹا شاہ بیگ ارغون قندھار کا حاکم مقرر ہوا۔ بعد ازاں اس نے سندھ پر حملہ کر کے سمن خاندان کے آخری حکمران جام فیروز سے حکومت چھین لی۔ اس طرح

1520ء میں سندھ پر ارغون حکومت کا آغاز ہوا۔

سندھ پر حملے اور قبضے کی داستان

سبی کی جنگ (1485ء)

ارغونوں نے سبی پر حملہ کیا، جو سندھ کا اہم سرحدی شہر تھا۔ جام نظام الدین نے دریاء خان کو سبی واپس لینے کا حکم دیا۔ دریاء خان نے ارغونوں کو شکست دے کر سندھ کی حکمرانی بحال کی۔ اس جنگ میں ذوالنون کا بیٹا سلطان محمد مارا گیا۔

ٹھٹھہ کی جنگ (1520ء)

جام نظام الدین کی وفات کے بعد سندھ میں سیاسی انتشار پیدا ہوا۔ شاہ بیگ ارغون نے اس موقع

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹھٹھہ پر حملہ کیا۔ دریاء خان نے بہادری سے مقابلہ کیا مگر شہید ہو گئے۔ ارغونوں نے ٹھٹھہ شہر کو نو دن تک لوٹا اور جلایا۔ بعد ازاں قاضی قادن کی اپیل پر قتل و غارت گری بند ہوئی اور جام فیروز و شاہ بیگ کے درمیان صلح ہوئی۔ سندھ دو حصوں میں تقسیم ہوا: جنوبی سندھ جام فیروز کے زیرِ حکومت اور شمالی سندھ شاہ بیگ ارغون کے تحت۔

ارغون دور کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی اثرات

ارغونوں کی حکومت نے سندھ کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا:

- سندھ کے قلعے، دیہات، مال و دولت غیر ملکیوں کے قبضے میں چلے گئے۔
- خراسان سے آئے ہوئے امیر اور پناہ گزین سندھ کی امن پسند فضا کے لیے عذاب بن گئے۔
- سندھی زبان، ثقافت اور روایات کو نظرانداز کیا گیا۔
- عوام کے حوصلے، فکر اور خودی کو شدید نقصان پہنچا۔

شاہ لطیف کا مذکورہ شعر اسی بیگانگی اور ثقافتی جبر کی علامت ہے۔

شاہ حسن ارغون اور ترخانوں کا دور

شاہ بیگ کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسن ارغون تخت نشین ہوا۔ اس نے ملتان فتح کیا، بکر اور سیہون

کے قلعے مضبوط کیے۔ 1555ء میں اس کی وفات کے بعد ترخان خاندان نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ ارغون و ترخان دور مجموعی طور پر 36 سال پر محیط رہا، مگر اس کے اثرات سندھ پر آئندہ تین صدیوں تک محسوس کیے گئے۔

سندھ کی مزاحمت اور قربانیاں

دریاء خان کے بیٹے محمود خان، موٹن خان اور جام سارنگ نے مزاحمت کی۔ ٹلٹی کی جنگ میں سوڈھوں نے بے مثال بہادری دکھائی، مگر بڑی تعداد میں شہید ہوئے۔ شاہ بیگ نے باغبان، سیہون اور بکر میں بغاوتوں کو کچلا، مگر سندھ میں کبھی سکون سے نہ رہ سکا۔

خونی برج کا واقعہ

بکر میں دھاریجا قبیلے نے بغاوت کی، جسے میر فاضل اور سلطان محمود نے سختی سے دبایا۔ 27 سرداروں کو موقع پر سزا دی گئی، باقی کو رات کے وقت قتل کر کے دریائے سندھ میں پھینک دیا گیا۔ وہ برج جہاں سے لاشیں پھینکی گئیں، بعد میں "خونی برج" کہلایا۔

اختتامی کلمات

ارغون، ترخان اور مغل دور کی مختصر حکمرانی نے سندھ کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی بنیادوں کو صدیوں تک متاثر کیا۔ شاہ لطیف کا شعر اس دور کی بیگانگی، ظلم اور سندھی شناخت

کی پامالی کا گہرا اظہار ہے۔
سندھ کی تاریخ میں یہ دور غلامی، مزاحمت اور قربانیوں کا باب ہے، جسے یاد رکھنا اور سمجھنا آج بھی ضروری ہے۔

ہالانی کی جنگ: کلہوڑوں سے تالپوروں تک حکومتی تبدیلی کا تاریخی احوال

رک سندھی

تاریخی پس منظر

سندھ کی تاریخ میں ہالانی کی جنگ ایک اہم موڑ ہے، جس نے صرف دو خاندانوں کے درمیان

اقتدار کی تبدیلی نہیں کی، بلکہ سندھ کے سیاسی، فوجی اور قبائلی نظام کو بھی نیا رخ دیا۔ مغل سلطنت کے کمزور ہونے کے بعد مقامی حکمرانوں کے لیے آزادی کے مواقع پیدا ہوئے۔ ان میں کلہوڑا خاندان سب سے نمایاں تھا۔

کلہوڑا حکمرانی کی ترقی

میاں یار محمد کلہوڑو، جو مذہبی پیشوا اور سیاسی رہنما دونوں حیثیتوں سے معروف تھے، نے 1701ء میں سندھ پر حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ ان کی حکومت کا دارومدار قبائلی اتحاد، مذہبی اثر اور فوجی طاقت پر تھا۔ کلہوڑا دور میں سندھ ایک حد تک خودمختار تھا، مگر دربار کے اندر قبائلی اختلافات، مالیاتی بدانتظامی اور مرکزی فوجی کمزوری کے باعث حکمرانی میں دراڑیں پڑ گئیں۔

تالپوروں کا عروج

تالپور بلوچ دراصل کلہوڑوں کی فوج میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا سیاسی اثر بڑھتا گیا۔ تالپور سردار میر فتح علی خان کو قبائلی اتحاد منظم کرنے اور فوجی حکمت عملی میں مہارت حاصل تھی۔ جب کلہوڑے کمزور پڑ گئے، تو تالپور ایک طاقتور متبادل کے طور پر سامنے آئے۔

جنگ کا جغرافیائی اور سماجی منظرنامہ

ہالانی کا میدان، جہاں یہ جنگ لڑی گئی، آج موجودہ نیشنل ہائی وے کے قریب واقع ہے، اور تاریخی ریکارڈ کے مطابق یہ میدان چار دیہات پر پھیلا ہوا تھا:

1. پیر وتیو

2. ہالانی
3. بہلانی
4. نیا آباد

یہاں آج بھی دو اہم قبرستان موجود ہیں:

- **دلو مشائخ کا قبرستان** – جہاں کلہوڑوں کا پڑاؤ تھا اور پھانسی گھاٹ بھی موجود تھا، جسے مقامی لوگ "سُوری" کہتے ہیں۔
- **پیر بالو کا قبرستان** – تالپوروں کے پڑاؤ کی جگہ، جو ہالانی – محرابپور ریلوے لائن کے جنوب میں ہے۔

ان قبرستانوں اور اطراف کے مقامات پر آج بھی جنگ کی نشانیاں اور مقامی روایات زندہ ہیں، جو اس وقت کی خونریز لڑائی کو یاد دلاتی ہیں۔

فوجی تیاری اور صف بندی

کلہوڑا لشکر

- **تعداد:** تقریباً 30,000 سپاہی
- **قبائلی جتھے:** لیغی، کھوسہ، نومڑیا اور دیگر مقامی قوموں کے لوگ
- **اتحادی:** پٹھان سپاہی اور قلات کے خان کی فوج کے دستے
- **اہم رہنما:**
  - محمد حسن کھاوڑ (سپہ سالار)
  - دھنگاہو خان جتوئی (ساہتی پرگنہ کا گورنر)
  - بلاول لیغی (راجو لیغی کا بیٹا)

تالپور لشکر

- **تعداد:** ابتدائی طور پر تقریباً 6,000، لیکن قبائلی اتحاد کے ساتھ تقریباً 30,000۔
- **اہم رہنما:**
  - میر فتح علی خان تالپور (سردار اور سپہ سالار)
  - میر باگو خان، میر الہی یار خان، میر ٹھارو خان
  - میر سہراب خان، نندو خان بھرگڑی

جنگ کی تفصیلی روداد

1782ء میں دونوں لشکروں میں کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچی۔ کلہوڑا لشکر نے "پیر ولی درویش" (دلو مشائخ) کے قبرستان پر پڑاؤ ڈالا، جبکہ تالپور لشکر نے "پریالوء" میں مورچہ بندی کی۔

ابتدائی حملہ

جنگ کا آغاز سخت تیراندازی اور نیزہ بازی سے ہوا۔ تالپور فوج تعداد میں کم ہونے کے باوجود صف بندی اور حکمت عملی میں منظم تھی۔ میر فتح علی خان نے اپنی فوج کو چھوٹے اور تیز حرکت کرنے والے دستوں میں تقسیم کیا، جو دشمن کے کمزور مقامات پر حملہ کرتے رہے۔

فیصلہ کن لمحہ

محمد حسن کھاوڑ نے کلہوڑوں کی طرف سے نہایت بہادری سے لڑائی لڑی، مگر ایک سخت مقابلہ میں وہ میر فتح علی خان کے ہاتھوں مارا گیا، جس سے کلہوڑا لشکر کی قیادت کمزور پڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پٹھان اور دیگر اتحادی بھی میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

میاں عبدالنبی کا فرار

میاں عبدالنبی نے لشکر کی شکست دیکھ کر بھلاٹي کے قریب ایک تالاب میں پناہ لی، پھر کشتی کے ذریعے دریا پار کر کے ٹکروں کی طرف نکل گیا، اور آخرکار جودھپور پہنچ کر پناہ لی۔ وہ 1805ء میں راجن پور میں وفات پا گیا۔

نتائج اور سیاسی اثرات

1. **حکومتی تبدیلی:** کلہوڑوں کی 82 سالہ حکمرانی کا خاتمہ ہوا اور تالپوروں کا دور شروع ہوا (1783ء – 1843ء)۔
2. **قبائلی اتحاد کی اہمیت:** تالپوروں کی کامیابی ان کے قبائلی اتحاد، منظم فوجی

حکمت عملی اور مقامی حمایت کے باعث ممکن ہوئی۔

3. **سیاسی استحکام:** ابتدائی تالپور دور میں نسبتاً امن قائم ہوا، مگر برطانوی اثر بتدریج بڑھتا گیا، جو آخرکار 1843ء میں سندھ پر برطانوی قبضے پر ختم ہوا۔

جنگ کے بعد کے واقعات

میر فتح علی خان نے نوشہرو فیروز میں فاتح کی حیثیت سے دربار لگایا، مخالف سرداروں کو معافی دی اور وفاداروں کو انعامات عطا کیے۔ کلہوڑا حامی کئی سردار تالپوروں کے ساتھ بیعت ہو گئے، جس سے ان کی حکمرانی مستحکم ہوئی۔

ضمیمہ: کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں کے مختصر پروفائلز

کلہوڑا حکمران (1701ء – 1783ء)

1. میاں یار محمد کلہوڑو (1701ء – 1719ء) – حکمرانی کے بانی، مغل دور میں سندھ کے گورنر، زراعت اور آبپاشی میں اصلاحات۔
2. میاں نور محمد کلہوڑو (1719ء – 1755ء) – کلہوڑا حکومت کا عروج، فوجی توسیع، شہروں کی آبادکاری۔
3. میاں مرادیاب خان کلہوڑو (1755ء – 1758ء) – مختصر دور، قبائلی اختلافات۔
4. میاں غلام شاہ کلہوڑو (1758ء – 1772ء) – سیاسی

قابلیت، پکا قلعہ تعمیر، نئے شہروں کی بنیاد۔

5. میاں سرفراز خان کلہوڑو (1772ء – 1775ء) – اندرونی سازشیں اور کمزوریاں۔
6. میاں عبدالنبی کلہوڑو (1775ء – 1783ء) – آخری حکمران، ہالانی میں شکست، جلاوطنی۔

تالپور حکمران (1783ء – 1843ء)

1. میر فتح علی خان تالپور (1783ء – 1801ء) – حکمرانی کے بانی، ہالانی کے فاتح، قبائلی اتحاد کے سربراہ۔
2. میر کرم علی خان تالپور (1801ء – 1828ء) – امن اور تعمیری منصوبوں کے حامی، حیدرآباد کی آبادکاری۔

3. میر مراد علی خان تالپور (1828ء – 1833ء) – تجارت کے فروغ کی کوششیں، برطانوی اثر کے تحت دور۔
4. میر نصیر خان تالپور (1833ء – 1843ء) – آخری حکمران، میانی اور ڈبی کی جنگوں میں شکست، سندھ پر برطانوی قبضہ۔

حوالہ جات

1. بریلوی، غلام رسول۔ *سندھ کی تاریخ میں کلہوڑے اور تالپور*۔ حیدرآباد: مہران اکیڈمی، 1985ء۔
2. لغاری، حفیظ۔ *ہالانی کی جنگ کا احوال*۔ ساہتیہ رسالہ، جنوری 1992ء۔

3. میمن، محمد صدیق۔ *نواب شاہ کے تاریخی مقامات*۔ نواب شاہ: ضلعی آرکائیو، 2003ء۔

تھر میں سوڈھا اور کولہی مزاحمت: برطانوی سامراج کے خلاف 16 سالہ جدوجہد

رک سندھی

تعارف

جب برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1843 میں سندھ پر حملہ کیا تو تالپور حکمرانوں پر ان کی تیز رفتار فوجی فتح نے خطے میں نوآبادیاتی تسلط کی بنیاد رکھ دی۔

لیکن دریائے سندھ کے کنارے آباد شہروں سے دور، تھر کے ریگستانی علاقے میں برصغیر کی تاریخ کی سب سے طویل اور پُرعزم مزاحمتی تحریکوں میں سے ایک کا آغاز ہوا۔

تھر کے سوڈھا راجپوت اور کولہی برادری—جن کی قیادت **روپلو کولہی**، **رانی کرن جی** اور **رتن سنگھ سوڈھا** جیسے جانبازوں نے کی—نے نئے سامراجی نظام کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔

سولہ برس (1843 تا 1859) تک یہ مزاحمت محض قبائلی جذبے، غیر معمولی جرات اور آزادی کے شوق سے جاری رہی، اور تھر برطانوی حکمتِ عملی کے لیے ایک ایسا کانٹا بن گیا جسے وہ آسانی سے نہیں نکال سکے۔

تھر کا جغرافیہ اور اس کی اسٹریٹجک اہمیت

تھر کا صحرا، جو آج کے سندھ، راجستھان اور کَچھ میں پھیلا ہوا ہے، محض بنجر زمین نہیں تھا۔ اس کی کٹھن زمین، کم پانی کے ذخائر، اور ریت کے پھیلے ہوئے ٹیلے مقامی لوگوں کے لیے فطری قلعے تھے۔ **کارونجھر پہاڑیاں**—جو ناگرپارکر میں اچانک میدانی علاقے سے ابھرتی ہیں—مقامی جنگجوؤں کے لیے محفوظ پناہ گاہ اور مستحکم مورچے ثابت ہوئیں۔ ایسے ماحول میں، برطانوی فوج کی ٹیکنالوجی پر مبنی برتری اکثر مقامی جغرافیہ کے ماہر جنگجوؤں کی چالاکیوں کے سامنے کمزور پڑ جاتی تھی۔

برطانوی قبضے کا پس منظر اور ابتدائی مزاحمت

سندھ کے الحاق کے بعد برطانوی حکام نے تھر میں نئی انتظامی تقسیم کی:

- **1844**: پارکر اور کانٹھو (جس میں مٹھی اور ڈپلو شامل تھے) کا انتظام کَچھ کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ریکس کے سپرد کیا گیا۔ تھر گڑھی، چھاچھرو اور عمرکوٹ میرپورخاص کے ڈپٹی کلیکٹر کے ماتحت آ گئے۔
- مقامی سرداروں کے روایتی حقوق ختم کر دیے گئے۔
- چراگاہ ٹیکس اور آمدنی کے نئے محصولات نافذ کیے گئے، جس سے قبائلی خودمختاری اور معاشی آزادی چھین لی گئی۔

یہ اقدامات سوڈھا راجپوت اور کولہی سرداروں کے لیے ناقابلِ قبول تھے۔ **1846** میں **رتن سنگھ سوڈھا** نے برطانوی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی قیادت کی۔ اگرچہ جنگ فیصلہ کن نہ تھی، برطانوی حکام نے بعد میں اسے دھوکے سے گرفتار کر کے 1866 میں پھانسی دے دی۔

روپلو کولہی اور گوریلا جنگ کی قیادت

اصل مزاحمتی لہر **15 اپریل 1859** کو ابھری، جب **روپلو کولہی**—ایک غیر معمولی جنگی حکمتِ عملی رکھنے والے سپہ سالار—نے برطانوی سلطنت کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان کیا۔

- انہوں نے **8,000 سے زائد کولہی جانبازوں** کو منظم کیا، سرکاری دفاتر پر حملے کیے، انتظامی ریکارڈ نذرِ آتش کیا اور خزانوں پر قبضہ کیا۔
- تین مواقع پر، ان کی فوج نے برطانوی دستوں کو شکست دی، رات کے چھاپوں، اچانک حملوں اور پہاڑی دروں کے کمالی استعمال سے دشمن کو پسپا کیا۔

جوابی کارروائی میں، کرنل ایوانز نے حیدرآباد سے **تیسری بلوچ رجمنٹ**، توپ خانے اور کمک کے ساتھ پیش قدمی کی، لیکن مہینوں تک روپلو کے گوریلا دستے انہیں ناکام بناتے رہے۔

کارونجہر اور چاندن گڑھ کا محاصرہ

کارونجہر کی بلندی پر واقع **چاندن گڑھ** اس مزاحمت کی علامت بن گیا۔ **3 مئی 1859** کو برطانوی توپوں نے شدید گولہ باری کے بعد اس کے قلعہ بند حصے کو منہدم کر دیا۔ روپلو کے ساتھی صحرا کی گہرائیوں میں بکھر گئے، مگر اگست کے آخر تک چھاپہ مار کارروائیاں جاری رہیں۔

دیگر رہنما اور نمایاں کارنامے

یہ جدوجہد صرف ایک شخص تک محدود نہ تھی۔ **رانی کرن جی**، **راجہ لدھو سنگھ ویرواہ**، **بھوپت سنگھ**، اور **اُدھی سنگھ سوڈھا** جیسے رہنماؤں نے بھی جرأت مندانہ کردار ادا کیا۔

- اُدھی سنگھ نے برطانوی جیلوں سے قیدی آزاد کروائے اور کرنل ٹروٹ کے کیمپ پر شب خون مارا، جس میں کرنل کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔
- رانی کرن جی کئی ماہ تک برطانوی گرفت سے بچتی رہیں، لیکن بعد میں غداری کے باعث گرفتار ہو کر کالا پانی (انڈمان جزائر) بھیج دی گئیں۔

غداری اور انجام

پانچ ماہ کی شدید جدوجہد کے بعد، روپلو کولہی گرفتار ہو گئے۔ رشوت اور دھمکیوں کے باوجود انہوں نے کبھی رانی کرن جی کا ٹھکانہ ظاہر نہ کیا۔ آخرکار مقامی غداروں—**سیٹھ مہاؤ جی لوہانی** اور **ہنس پوری باوی**—نے رہنماؤں کو دھوکے سے پکڑوایا، اور برطانوی حکومت نے مزاحمت

کے ڈھانچے کو توڑ دیا۔ مزاحمت کرنے والے سرداروں کی زمینیں ضبط کر لی گئیں، جبکہ غداروں کو انعام میں جاگیریں اور مالی مراعات ملیں۔

اگست 1859 تک برطانوی پارکر پر قابض ہو چکے تھے، مگر اس طویل مہم نے ان کے وسائل اور فوجی وقار کو سخت نقصان پہنچایا۔ روپلو کولہی کی پھانسی کے ساتھ تھر کی مسلح جدوجہد کا باب بند ہوا۔

وراثت

تھر کے سوڈھا، کولہی، بھیل اور کھوسے قبائل نے کسی سلطنت کی وسعت کے لیے نہیں بلکہ عزت، خودمختاری اور اپنی طرزِ زندگی کے تحفظ کے لیے لڑائی لڑی۔ ان

کی قربانیوں اور بہادری کی داستان جنوبی ایشیائی مزاحمتی تاریخ کا سنہری باب ہے۔
آج بھی سندھ میں روپلو کولہی کا نام ایک شہید کے طور پر زندہ ہے، جس نے غلامی پر موت کو ترجیح دی۔ کارونجھر کی پہاڑیاں آج بھی اس کی داستان سناتی ہیں اور یہ یاد دلاتی ہیں کہ آزادی کی پیاس ریگستانوں میں بھی کبھی نہیں بجھتی۔

خاصائی کی جنگ: سندھ کے سورماؤں کی مزاحمت کی داستان

رک سندھی

خاصائی کی جنگ سندھی عوام اور ارغون قابض افواج کے درمیان موجودہ ضلع جامشورو کے گاؤں خاصائی کے مقام پر لڑی گئی تھی۔ اس گاؤں کی ایک اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے قریب سندھ کے نامور جرنیل **دولہہ دریاء خان** کی اوطاق (ماڑی) موجود تھی۔ یہ اوطاق گوپانگ ریلوے اسٹیشن کے قریب آج بھی خستہ حالت میں موجود ہے، جسے مقامی لوگ *دولہہ دریاء خان* کی *ماڑی* یا *اوطاق* کہتے ہیں۔ پیر

علی محمد راشدی نے اپنی کتاب *اُھي ڏينھن اُھي شينھن* میں لکھا ہے کہ جب دولہ دریاء خان، جو سمن دور کا سپہ سالار تھا، ٹھٹھہ (اس وقت کا دارالحکومت) سے باغبان ٹلٹی اپنے گاؤں جاتا تھا تو اسی ماڑی میں قیام کرتا تھا۔

ارغون دور کی پس منظر

ارغون خاندان نے 1520ء سے 1555ء تک سندھ پر حکومت کی۔ اس سے پہلے سندھ پر سمن جامن کی آزاد حکومت قائم تھی، جسے 1520ء میں ختم کر دیا گیا۔ شاہ بیگ ارغون کے بعد اس کا بیٹا مرزا شاہ حسن ارغون سندھ کے تخت پر بیٹھا۔

مانجھنداور خاصائی

ضلع جامشورو کے تعلقے مانجھند کا تاریخی گاؤں خاصائی ہے۔ مانجھند شہر دو بار دریائے سندھ کے طغیانی میں بہہ چکا ہے اور موجودہ مانجھند تیسری بار آباد ہوا۔ قدیم دور میں دریائے سندھ کی وجہ سے یہ علاقہ ایک بڑا تجارتی مرکز تھا اور یہاں کے لوگ دنیا بھر میں ’’سندھ ورکی‘‘ کہلاتے تھے۔ ان کا تجارتی نیٹ ورک جاوا، سری لنکا، گجرات، روم، ایران، عراق، افریقہ اور یورپ تک پھیلا ہوا تھا۔ مانجھند میں خوبصورت عمارتیں اور تاریخی آثار موجود تھے۔

اسی تعلقے میں **رنی کوٹ قلعہ** بھی واقع ہے، جو "دیوار سندھ" کے نام سے مشہور ہے اور آج ایک اہم سیاحتی مرکز ہے۔ اسی علاقے کا ایک اور تاریخی پہلو یہ ہے کہ **شہید مخدوم بلاول** کو بھی

ارغونوں نے یہاں ہی گہنے میں پیس کر شہید کیا تھا۔ ان کے پیروکار سید حیدر سنائی نے بھی ارغونوں کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ اس طرح یہ علاقہ بھی سندھ کے دوسرے حصوں کی طرح ہمیشہ حملہ آوروں کے خلاف لڑائی کا مرکز رہا۔

خاصائی کی جنگ

خاصائی کے مقام پر سندھی عوام نے ارغونوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ ارغونوں نے سندھ پر قبضے کے بعد مقامی لوگوں پر جبری محصولات عائد کیے اور لوٹ مار شروع کی، جس کے نتیجے میں سندھیوں نے بغاوت کی۔ یہ جنگ سندھ کی آزادی کے تحفظ اور غلامی کے انکار کی علامت بن گئی۔

سندھی فوج کے درجنوں بہادر جوانوں نے شجاعت کے ساتھ لڑتے ہوئے ارغونوں کو شکست دی اور انہیں پسپا کیا۔ مگر ایک مرحلے پر غداری کے باعث جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور سیکڑوں جوانوں کی شہادت کے باوجود جنگ ہار گئے۔

غداری اور عوامی رائے

علاقے کے بزرگوں کے مطابق غداری کسی پوری برادری نے نہیں کی بلکہ چند افراد نے ذاتی فائدے کے لیے ارغونوں کی مدد کی۔ بعد میں ان غداروں کو معاشرتی بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا اور تاریخ میں ان کے نام تک مٹ گئے۔

عوامی قربانیاں

اس جنگ میں دولہے دریاء خان کے پیروکاروں نے بھی بڑی تعداد میں حصہ لیا، کیونکہ اس علاقہ میں ان کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ ان کے علاوہ انڑپور، بدھپور، بیلو انڑ، آمری، مانجھند، بھورو واہ، ڈابھری، جھلو، کاچو، لاکڙي، لکی، نورپور، راجڑي، سن، ٹیباٹ سمیت کئی علاقوں کے عوام نے اپنی سرزمین کے تحفظ کے لیے قربانیاں دیں۔

شریک برادریاں

اس جنگ میں **مانجھند برادری، پنپرا، چاچڑ، گائینچا، کماٹ، کوریجا، لاکا ۽ راچڑ** برادریاں نمایاں طور پر ارغونوں کے خلاف میدان میں اتریں۔ ان کے بزرگوں کی روایت ہے کہ اگرچہ وہ جدید اسلحہ اور فوجی تجربہ سے محروم تھے مگر سندھ کے بیٹوں نے

اپنی بہادری سے دشمن کو لرزا دیا۔

نتیجہ

خاصائی کی یہ جنگ سندھ کی عوامی مزاحمت کا عظیم نشان ہے۔ اگرچہ جنگ کا انجام شکست پر ہوا، مگر اس میں دی گئی قربانیاں اور بہادری آج بھی سندھ کی تاریخ میں فخر کا مقام رکھتی ہیں۔ سندھ آج بھی ان شہیدوں پر ناز کرتا ہے جنہوں نے وطن کے تحفظ کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔

ارغونوں کے حملے اور ملتان کا المیہ: جب لوگ کتے اور بلیاں کھانے پر مجبور ہوئے

رک سندھی

تمہید

سندھ اور ملتان کی تاریخ بیرونی حملہ آوروں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر نیا حملہ آور صرف سیاسی غلبہ حاصل کرنے نہیں آتا تھا بلکہ عوام کے وسائل کو لوٹنے اور ان کی مزاحمتی قوت کو توڑنے کے لیے بھی کوشاں رہتا تھا۔ انہی دوروں میں سے ایک دور **ارغون خاندان** کا ہے۔ مرزا شاہ حسن ارغون (1524ء–1555ء) کی حکومت خاص طور پر عوام کے لیے

ایک انسانی المیہ ثابت ہوئی، جس میں ملتان کا ایک سالہ محاصرہ سب سے زیادہ دل دہلا دینے والا باب ہے۔

شاہ حسن ارغون کے اقتدار کا پس منظر

1524ء میں شاہ بیگ ارغون کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مرزا شاہ حسن تخت نشین ہوا۔ نصرپور میں تخت نشینی کے بعد اس نے اپنی حکومت کو خالصتاً فوجی طاقت کی بنیاد پر استوار کیا۔ اس نے ٹھٹہ پر حملہ کیا، جام فیروز کو شکست دے کر بھگا دیا اور پھر بدین و کَچھ کے ساتھ معرکہ لڑے۔

تاریخ معصومی میں درج ہے:

"مرزا شاہ حسن کی فوج نے ٹھٹہ پر حملہ کرکے شہر پر قبضہ کیا۔ جام فیروز بھاگ کر کَچھ چلا گیا اور اس کے بعد سندھ کی ساری حکومت ارغونوں کے قبضے میں آگئی۔"
(تاریخ معصومی، ص 112)

ملتان کی جانب فوجی مہم

بکر میں اقتدار مضبوط کرنے کے بعد مرزا شاہ حسن کی توجہ ملتان کی طرف ہوئی۔ اس وقت وہاں **لانگاہ خاندان** کی حکومت تھی جو اندرونی کمزوریوں کا شکار تھی۔ مرزا شاہ حسن کے لیے ملتان پر قبضہ معاشی اور فوجی دونوں اعتبار سے ضروری تھا۔

طبقات اکبری میں لکھا ہے:

"ملتان کے حاکم حسین لانگاہ کی حکومت کمزور تھی۔ مرزا شاہ حسن ارغون نے اس موقع کو غنیمت جانا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔"
(طبقات اکبری، جلد دوم، ص 245)

ملتان کا ایک سالہ محاصرہ

1526ء کے آخر میں ارغونوں نے ملتان کا محاصرہ کیا۔ حسین لانگاہ نے کئی بار صلح کی کوشش کی، مگر شاہ حسن نے انکار کر دیا۔ محاصرہ ایک سال تک جاری رہا۔

- شہر میں اناج بالکل ختم ہوگیا۔
- لوگ رب اور شوروا بنا کر گزارا کرنے لگے۔

- آخرکار شہر کے باسی **کتے اور بلیاں کھانے پر مجبور ہوگئے۔**

تاریخ معصومی میں اس کا ذکر یوں ملتا ہے:

"محاصرے کی وجہ سے شہر کے لوگ بھوک سے نڈھال تھے۔ اناج نایاب ہوگیا۔ حیوانات کا گوشت، بلکہ کتوں اور بلیوں کو بھی گوشت کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔"
(*تاریخ معصومی، ص 118*)

قلعے کا سقوط اور قتلِ عام

15 جنوری 1527ء کو ارغونوں نے لوہے کا دروازہ توڑ کر قلعے میں داخل ہوکر قتلِ عام اور لوٹ مار

شروع کی۔ یہ خونی سلسلہ بارہ دن تک جاری رہا۔

طبقات اکبری میں اس قتلِ عام کی تفصیل یوں درج ہے:

"جب دروازہ ٹوٹا تو لشکر اندر داخل ہوا۔ مرد، عورت اور بچے، کسی کو نہیں بخشا گیا۔ بہت سے لوگوں کو خانقاہوں اور درگاہوں میں تلاش کرکے قتل کیا گیا۔"
(طبقات اکبری، جلد دوم، ص 247)

سلطان محمود لانگاہ کے بیٹے حسن اور اس کی بیٹی کو قید کرلیا گیا۔ بیٹی کو زبردستی شادی کے لیے حوالے کیا گیا، جو عوام کے لیے مزید توہین کا باعث تھا۔

تاریخی و تحقیقی جائزہ

ملتان کے محاصرے اور قتلِ عام کے تذکرے مختلف تاریخی ماخذوں میں موجود ہیں۔ سب مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ محاصرہ عوام کے لیے ایک انسانی المیہ تھا۔

1. **تاریخ معصومی** اسے عوامی بے بسی کا باب قرار دیتی ہے۔
2. **طبقات اکبری** ارغونوں کی بے رحمی کی تفصیلات پیش کرتی ہے۔
3. مقامی روایات میں ملتان کے لوگوں کی بھوک اور پیاس کو ایسا عذاب کہا گیا ہے جو صرف خارجی ظلم کی وجہ سے نازل ہوا۔

نتیجہ

شاہ حسن ارغون کی حکومت مسلسل جنگوں، قتل اور لوٹ مار

میں گزری۔ اس کا سب سے بڑا جرم ملتان کا ایک سالہ محاصرہ تھا، جہاں لوگ بھوک کے ہاتھوں کتے اور بلیاں کھانے پر مجبور ہوگئے۔

یہ واقعہ صرف ایک تاریخی یادگار نہیں بلکہ ایک سبق بھی ہے کہ جب بیرونی حکمرانوں کے خلاف مقامی اتحاد کمزور ہوجائے تو عوام کو بدترین بربادی اور بے بسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حوالہ جات:

1. میر محمد معصوم بکھری، *تاریخ معصومی*، ایڈیشن 1938ء، ص 112–118۔
2. ابو الفضل، *طبقات اکبری*، جلد دوم، کلکتہ ایڈیشن 1877ء، ص 245–247۔

جب سکندرِ اعظم نے ماچھی
قبیلے کے جنگجو بادشاہ کو
اروڑ میں پھانسی دی

رُک سندھی

تعارف

دنیا کی تاریخ ماچھیمیں کئی فاتحین نے اپنے نام رقم کیے، مگر کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے ہر سرزمین پر بغیر مزاحمت کے فتح حاصل ہوئی ہو۔ مقدونیہ کا بادشاہ سکندر، جسے مغرب میں "سکندرِ اعظم" کہا جاتا ہے، نے صرف تیرہ سالہ فوجی مہم میں ایران، مصر، افغانستان، پنجاب اور آخرکار سندھ تک اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ مگر جب وہ وادئ سندھ میں داخل ہوا، تو یہاں کے لوگوں کی آزادی کی روح اور بہادری نے اسے ایسے زخم دیے جو اس کی آخری سانس تک اس کے ساتھ رہے۔

سکندر کا حملہ اور سندھ کا پس منظر

356 قبلِ مسیح میں پیدا ہونے والا سکندر 326 قبلِ مسیح میں وادئ سندھ کی طرف بڑھا۔ پنجاب کے کئی حکمرانوں نے اس کے آگے سر جھکا دیا، مگر سورما جیسے پورس نے مزاحمت کی راہ اختیار کی۔ یونانی مؤرخ پلٹارک لکھتا ہے:

"پورس کی فوج میں سب سے بہادر جنگجو سندھ کے کھتری اور مالی قبیلے کے لوگ تھے، جنہوں نے سکندر کو زخمی کیا اور اس کی فوج کا حوصلہ توڑ دیا۔"

ملتان میں مالی (مالہی) قبیلے نے 900 جنگی ہاتھیوں اور ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ سکندر کا سامنا کیا۔ اسی جنگ میں سکندر کو تیر لگا اور وہ شدید زخمی ہوا۔

سندھ میں مزاحمت

محمد ابراہیم جوئیو اپنی کتاب *شاہ، سمی اور سچل* میں لکھتے ہیں:

"325 قبلِ مسیح میں جب سکندر سندھ میں داخل ہوا، تو برہمنوں نے بار بار عوام کو حملہ آور کے خلاف اٹھنے کی تلقین کی۔ سندھ میں ایک روحانی قوت چھپی ہوئی تھی جو لوگوں کے حوصلے کو زندہ رکھتی تھی۔ یہی قوت تھی جس نے سندھیوں کو ہر گاؤں اور بستی میں سکندر سے لڑنے پر آمادہ کیا۔"

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے مطابق:

"سکندر جہاں بھی سندھ سے گزرا، مقامی لوگوں نے سخت مزاحمت کی۔ سندھ کے حکمرانوں کے پاس 2 لاکھ پیادہ فوج، 20

ہزار سوار، اور 4 ہزار جنگی ہاتھی تھے۔ ایسی زبردست فوج کے ہوتے ہوئے سکندر کے لیے فتح آسان نہ تھی۔"

ماچھی قبیلے کا بادشاہ — آزادی کی علامت

اروڑ (الور) میں ماچھی قبیلہ، جسے یونانی مؤرخین *Massicans* کہتے ہیں، سکندر کی فوج کے خلاف ڈٹ گیا۔ ان کے بہادر بادشاہ نے خود اپنی فوج کی قیادت کی اور دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہوا۔

اس جنگ میں سکندر کے سینکڑوں سپاہی مارے گئے۔ یونانی مؤرخ اریئن لکھتا ہے:

"Massicans کی مزاحمت نے سکندر کو شدید نقصان پہنچایا۔"

مگر جدید ہتھیاروں اور منظم فوج کی کمی کے باعث ماچھی قبیلہ شکست کھا گیا۔ بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا، اور سکندر نے حکم دیا کہ اسے اروڑ کے مرکزی چوک میں برہمنوں کے ساتھ سرِعام پھانسی دی جائے۔

یہ منظر سندھ کی تاریخ میں ایک لازوال یاد بن گیا—ایک بادشاہ جس نے اپنی سرزمین کے لیے جان دے دی مگر سکندر کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔

سیہون اور ماچھَر کے ماہی گیروں کی مزاحمت

سیہون میں راجا سمبس اور برہمنوں نے عوام کی قیادت کی۔ فتح کے بعد سکندر نے تمام برہمنوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

واپسی کے سفر میں مانچھَر جھیل کے ماہی گیروں نے تیر اور کتوں سے سکندر کی فوج پر حملہ کیا، جس میں سکندر ایک بار پھر زخمی ہوا۔

مؤرخین کی گواہیاں

- پلٹارک: "پورس کی فوج میں مالی جنگجو سکندر کے سپاہیوں کی موت کا سبب بنے۔"
- ایچ ٹی لیمبرک: "سکندر کے خلاف طویل اور خونریز جنگیں سندھ کے لوگوں کی آزادی کی شدید خواہش کو ظاہر کرتی ہیں۔ سکندر کو سندھ میں ایک لمحہ بھی سکون نصیب نہ ہوا۔"
- رابن لین فاکس: "پورس نے سکندر سے عزت چھینی، اسی لیے سکندر نے اسے عزت دی۔"

اختتامیہ

سکندرِ اعظم کے لیے سندھ ایک آگ اور مزاحمت کی سرزمین ثابت ہوئی۔ ماچھی قبیلے کے بادشاہ کی قربانی، برہمنوں کا انقلابی کردار، پورس کی فوج میں سندھی کھتریوں کی بہادری، اور ماہی گیروں کا حملہ—یہ سب مل کر ظاہر کرتے ہیں کہ سندھی قوم نے کبھی بھی بیرونی حملہ آوروں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

یہ تاریخی واقعہ صرف ماضی کی کہانی نہیں—یہ آزادی اور حب الوطنی کی زندہ علامت ہے، جو آج بھی سندھ کی وراثت کو امر کیے ہوئے ہے۔

حوالہ جات

1. پلٹارک، *سوانح حیاتِ سکندر*
2. اریئن، *اناباسس آف الیگزینڈر*
3. ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، *تاریخِ سندھ*
4. محمد ابراہیم جوئیو، *شاہ، سمی اور سچل*
5. ایچ ٹی لیمبرک، *سندھ: ایک عمومی تعارف*
6. رابن لین فاکس، *سکندرِ اعظم*

راجپوت نسل سے سندھ کی جدید ذاتوں کا ارتقاء

رک سندھی

جب ہم سندھ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں اسے صرف موجودہ جغرافیائی حدود تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اسے ہزاروں سال پرانی سندھ یا سندھُو ماں (سندھو ماں) تہذیب کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس خطے میں آج کا پاکستان مکمل طور پر شامل ہے، کیونکہ موجودہ پاکستان دراصل سندھُو ماں تہذیب کی سرحدوں پر قائم ہے۔ اس لیے اس خطے میں بسنے والی تمام برادریاں ایک ہی تہذیبی اور نسلی تسلسل کا حصہ ہیں، جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

قدیم قبائل: جاٹ اور مَید

رامائن اور مہابھارت جیسے دھارمک متون میں سندھ کے قبائل

کا ذکر ملتا ہے، جن میں جاٹ اور مَید دو اہم قبائل تھے۔ جاٹ مال مویشی چراتے اور اونٹوں پر بوجھ ڈھوتے تھے، جبکہ مَید دریا اور سمندر کے کنارے آباد ہو کر مچھلی پکڑنے اور کشتی رانی جیسے پیشوں سے وابستہ تھے۔ بعد میں جاٹ لفظ "جٹ" اور مَید "میر بحر" یا "ملاح" میں تبدیل ہو گئے۔ یہ دونوں قبائل سندھُو ماں تہذیب کے اصل باشندے تھے، جن کے آثار 1500 قبل مسیح سے بھی پہلے کے ملتے ہیں۔

سماٹ ذاتیں: راجپوت نسل کی شاخیں

سوال اٹھایا گیا کہ آیا سماٹ ذاتیں سما قبیلے سے نکلی ہیں یا نہیں؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سماٹ ذاتیں دراصل راجپوت نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ راءِ خاندان،

جو سندھ پر حکمران تھا، راجپوت نسل کے سما تھے۔ ان ہی سے سندھ کی سماٹ ذاتیں وجود میں آئیں۔ اس لیے سماٹ ذاتوں کا دائرہ صرف سندھ تک محدود نہیں بلکہ پورے پنجاب اور پاکستان تک پھیلا ہوا ہے۔

نامور محقق الٰہ رکھیو بٹ کے مطابق سندھ میں جاٹ، مَید اور راجپوت نسل کی ذاتیں آج "سماٹ" کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ سما حکمران بھی راجپوت ہندو تھے، جو بعد میں 1391ء میں مسلمان ہوئے۔

عربوں کی آمد اور ذاتوں کی تبدیلی

عربوں کی فتح کے وقت سندھ میں سما، لاکا، لوہانہ اور جاٹ جیسے قبائل آباد تھے۔ ان میں سے کچھ نہ

اسلام قبول کیا اور کچھ ہندو مذہب پر قائم رہے۔ چچ نامہ کے مطابق راجا داہر کی فوج میں راجپوت نسل کے ٹھاکر شامل تھے۔ سومرا اور سما لشکروں میں بھی راجپوت نسل کے افراد شامل تھے، جن کا تعلق جاڑیجا خاندان سے تھا۔ جاڑیجا خود کو سما نسل سے جوڑتے ہیں اور ان کی حکومتیں کَچھ، بھُج اور کاٹھیاواڑ میں قائم تھیں۔

جدید ذاتیں اور ان کی اصل

الٰہ رکھیو بٹ کے مطابق سندھ کی جدید ذاتوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے: سماٹ اور غیر سماٹ۔ غیر سماٹ میں سید، بلوچ، پٹھان وغیرہ شامل ہیں، جو وقت کے ساتھ سندھ میں رچ بس گئے ہیں۔

سندھ کی سماٹ ذاتوں میں شامل ہیں:

- **جاٹ کی شاخیں**: ابڑہ، کَلھوڑا، کوکَر، ماچھی، پلال، تنیو، ملاح
- **پنجاب کی سماٹ ذاتیں**: اعوان، سیال، کوکَر، آہیر، بڈا، بھگت، بھنڈ، بوہر، جویا، کمٹیا، مسن، سامٹیا، سہاگ، تیونا، ٹاٹڑی، ٹگر
- **سندھ کی سماٹ ذاتیں**: راٹھوڑ، پنھور، برڑا، سمیجا، جوکیا، نومڑیا، تھیبا، دیپر، راجڑا، منگریا، لاڑک، کاٹھیا، مھر، دھڑ، دھاریجا

نسلوں کی شناخت اور نفسیاتی غلامی

عربوں کی آمد کے بعد کئی مقامی قبائل نے اپنی شناخت عرب نسل

سے جوڑنے کی کوشش کی، جیسے قریشی، انصاری، ہاشمی، صدیقی، فاروقی، سید، مغل، پٹھان وغیرہ۔ الٰہ رکھیو بٹ کے مطابق یہ ایک نفسیاتی غلامی تھی، جس کا مقصد حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا اور مذہبی وابستگی ظاہر کرنا تھا۔

مثال کے طور پر:

- **تھہیم ذات**: کبھی خود کو تمیمی عرب کہتے ہیں، کبھی بلوچ، حالانکہ وہ اصل میں سماٹ قوم کے جاموٹ ہیں۔
- **سرائي ذاتیں**: پنجاب سے آ کر سندھ میں آباد ہوئیں، جٹکی یا سرائیکی بولتی ہیں، اور خود کو جٹ یا سماٹ کہتی ہیں۔

تاریخی تسلسل اور تہذیبی وحدت

سندھُو ماں تہذیب کے جاٹ اور راجپوت نسل سے سندھ کی کئی جدید ذاتیں وجود میں آئیں۔ آج بھی پنجاب میں انہیں "جٹ" اور سندھ میں "سماٹ" کہا جاتا ہے، مگر ان کا اصل نسلی پس منظر راجپوت ہے۔ سندھ میں مختلف قوموں کی آمد اور ان کا مقامی معاشرے میں ضم ہونا ایک فطری تاریخی عمل رہا ہے۔

سندھ کی ذاتوں، قبائل اور قومی شناخت کا تحقیقی جائز

رُک سندھی

تعارف

قوموں کی شناخت، ثقافت اور تاریخی شعور ان کی اجتماعی نفسیات کی بنیاد بنتے ہیں۔ جب قومیں غلامی کے دور سے گزرتی ہیں تو ان کے افراد میں احساسِ کمتری جنم لیتا ہے، جو ان کی قومی تشخص کو متاثر کرتا ہے۔ سندھ، جو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے، تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسے نفسیاتی بحران سے گزر چکی ہے۔ اس تحقیقی مضمون کا مقصد سندھ کی ذاتوں، قبائل اور برادریوں کی شناخت کو بحال کرنا، ان کے تاریخی پس منظر کو اجاگر کرنا اور قومی فخر کے شعور کو فروغ دینا ہے۔

غلامی، احساسِ کمتری اور غیر ملکی اثرات

تاریخ گواہ ہے کہ جب قومیں غیر ملکی قبضہ میں آتی ہیں تو ان کے افراد نفسیاتی طور پر فاتحین کو اعلیٰ اور خود کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔ نتیجتاً مفتوحہ قوموں کے افراد فاتحین کی ثقافت، نام، رسوم و رواج اور ذاتی شناخت کو اپنانے لگتے ہیں۔ سندھی قوم بھی انگریزوں کے دور کے بعد ایسی ہی صورتحال سے گزری، جہاں کئی قبائل اور برادریوں نے اپنی اصل شناخت کو بھلا کر غیر قوموں کے ناموں سے پہچانے جانے میں فخر محسوس کیا۔

سندھی قوم کی تہذیبی وراثت اور شناخت

سندھی قوم دنیا کی قدیم تہذیب، یعنی وادئ سندھ کی وارث ہے۔ سندھیوں کی زبان، ادب، ثقافت، فنون اور سماجی اقدار بے حد مالا

مال ہیں۔ سندھی قوم امن پسند، تعمیری سوچ رکھنے والی اور دوسروں کے وسائل پر قبضہ کرنے والی قوم نہیں رہی ہے۔ سندھی عورتوں کا احترام، دیگر قوموں سے ہم آہنگی اور اپنی زمین سے وابستگی ان کی شناخت کے اہم اجزاء ہیں۔

ذات بدلنے اور غیر قوموں کی شناخت اپنانے کے اثرات

حالیہ برسوں میں سندھ میں کچھ برادریوں کی جانب سے غیر قوموں کی شناخت اپنانے کا رجحان بڑھا ہے، جو قومی تشخص کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ رجحان نہ صرف تاریخی شعور کی کمی کا نتیجہ ہے بلکہ احساسِ کمتری کی علامت بھی ہے۔ سندھی قبائل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اصل

شناخت کو بحال کریں اور فخر سے سندھی ہونے کا اظہار کریں۔

مورخین کی غفلت اور غیر ملکیوں کی مسخ شدہ تاریخ

انگریزوں کے دور کے بعد سندھی ادیبوں اور مورخین کی جانب سے سندھ کے قبائل، ذاتوں اور سورماؤں پر علمی تحقیق کم ہوئی، جس کا فائدہ غیر ملکی مصنفین نے اٹھایا۔ انہوں نے سندھ کے بہادر قبائل کو غیر سندھی قرار دینے کی کوشش کی اور تاریخ کو من گھڑت روایات کی بنیاد پر مسخ کیا۔ نتیجتاً کئی خالص سندھی قبائل آج خود کو دیگر قوموں سے منسوب کرتے ہیں۔

نتیجہ اور سفارشات

سندھی قوم کی شناخت کی بحالی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ

مضمون درج ذیل سفارشات پیش کرتا ہے:

- سندھی مورخین، ادیب اور محققین سندھ کے قبائل، ذاتوں اور برادریوں پر علمی تحقیق کریں۔
- تعلیمی ادارے، میڈیا اور ثقافتی تنظیمیں قومی شناخت کے شعور کو فروغ دیں۔
- سندھی عوام اپنی ذات، قبیلے اور تاریخ کے بارے میں درست معلومات فراہم کریں تاکہ انہیں علمی ریکارڈ میں شامل کیا جا سکے۔
- وی لاگز، کتابوں اور دستاویزی فلموں کے ذریعے سندھی شناخت کو اجاگر کیا جائے۔

ناظرین اور قارئین کے لیے اپیل

ہماری زمین، ہماری شناخت اور ہماری تہذیب فخر کا باعث ہیں۔ آئیے مل کر اپنی اصل شناخت کو بحال کریں اور دنیا کے سامنے فخر سے کہیں:

"ہم سندھی ہیں، ہم اس دھرتی کے اصل وارث ہیں!"

سندھ پر رائے خاندان کی حکومت: ایک مثالی دور کی کہانی

رک سندھی

تاریخ میں لکھا گیا ہے کہ رائے دیواج سندھ کا شاندار بادشاہ تھا۔ ہندوستان کے تمام حکمران اس کے مخلص اور خیرخواہ تھے۔ دانا اور قابل افسران کی زیر نگرانی پورے ملک کا انتظام بہترین انداز میں چلتا رہا۔ یہ رائے دیواج کون تھا اور کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا؟ آئیے آج ہم اسی خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

سندھ میں رائے خاندان کی حکومت

سندھ کی تاریخ میں رائے خاندان کی حکومت (450ء تا 642ء) یعنی

تقریباً 192 سال تک قائم رہی۔ یہ دور سندھ کی سرحدوں کے استحکام، امن و امان اور معاشی خوشحالی کے لحاظ سے ایک مثالی دور مانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ملک کے باسیوں میں نہ کوئی اندرونی خلفشار تھا، نہ مذہب کی بنیاد پر کوئی عداوت پائی جاتی تھی۔

انتظامی تقسیم اور معیشت

ملک کو چار صوبوں (پرگنوں) میں تقسیم کیا گیا تھا:

1. ملتان
2. اُچ
3. برہمن آباد
4. سیہون

ان صوبوں پر رائے خاندان کی جانب سے گورنر مقرر کیے گئے تھے۔ سلطنت کا دارالحکومت اروڑ تھا، جب کہ دیبل اس وقت کا سب سے بڑا بندرگاہ تھا، جہاں سے بین الاقوامی تجارت ہوا کرتی تھی۔ اس دور میں بدھ مت سندھ کا سرکاری مذہب تھا۔ رعایا خوشحال اور امن قائم تھا۔

حکمرانوں کی فہرست

رائے خاندان کے پانچ بادشاہ سندھ پر حکومت کرتے رہے:

1. رائے دیواج (دیواج/دیواچی)
2. رائے سہیرس (پہلا)
3. رائے ساہسی (پہلا)
4. رائے سہیرس (دوسرا)
5. رائے ساہسی (دوسرا)

تاریخی ماخذات میں ان کے نام اور ادوار میں کچھ اختلافات ملتے ہیں، تاہم زیادہ تر مورخین ان پانچ بادشاہوں پر متفق ہیں۔

نمایاں واقعات

- رائے دیواج نے سلطنت کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔
- رائے سہیرس (دوسرا) کے عہد میں نمرود کے حاکم نے حملہ کیا، جس کے خلاف "ذات السلاسل" (زنجیروں کی جنگ) لڑی گئی۔ اس جنگ میں رائے سہیرس نے جان قربان کی مگر سندھ کو دشمن کے قبضے میں نہ جانے دیا۔
- رائے ساہسی (دوسرا) نے سلطنت کو دوبارہ منظم کیا۔ اس کے دربار میں برہمن نوجوان "چچ" ملازم ہوا، جو

بعد میں اپنی ذہانت اور تعلقات کے ذریعے اقتدار تک پہنچا۔ رانی سونہ دیوی نے بھی چچ سے شادی کی۔ یوں رائے خاندان کا خاتمہ ہوا اور سندھ میں برہمن خاندان (چچ خاندان) کی حکومت قائم ہوئی۔

نتیجہ

رائے خاندان کا دور سندھ کی تاریخ میں امن، انصاف، خوشحالی اور مذہبی رواداری کا سنہرا باب ہے۔ اروڑ کے کھنڈر، قدیم قلعے اور قلعہ بندیاں آج بھی اس شاندار دور کی یاد دلاتی ہیں۔

سندھ کے قبائل اور شاہ بیگ ارغون کے خلاف مزاحمت

رُک سندھی

تمہید

سندھ کی تاریخ بیرونی حملہ آوروں اور مقامی عوام کی مزاحمت سے عبارت ہے۔ جب بھی غیر ملکی طاقتوں نے سندھ پر یلغار کی، تب مقامی قبائل نے اپنی زمین، ثقافت اور آزادی کے تحفظ کے لیے بھرپور قربانیاں دیں۔ سولہویں صدی کے اوائل میں شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر حملہ کیا، اور سمہ خاندان کے آخری حکمران جام فیروز کو شکست دے کر ارغونوں کی حکومت قائم کی۔ لیکن سندھ کے قبائل نے کبھی بھی غیر ملکی اقتدار کو دل سے تسلیم نہ کیا، بلکہ ہر محاذ پر اس کے خلاف مزاحمت کی۔

ارغونوں کا پس منظر

شاہ بیگ ارغون قندھار کا حاکم تھا، جس نے 1520ء میں سندھ پر لشکر کشی کی۔ اس وقت سمہ

حکومت کمزور ہوچکی تھی اور جام فیروز کی نااہلی کے باعث سیاسی ابتری بڑھ گئی تھی۔ یہی وہ موقع تھا جس کا فائدہ اٹھا کر ارغون سندھ میں داخل ہوئے۔

سندھ کے قبائل کی مزاحمت

سمہ قبیلہ

سمہ خاندان سندھ میں آزادی کی علامت تھا۔ جام نظام الدین (جام نندو) نے اپنے سپہ سالار دولہا دریائے خان کے ذریعے سبی اور دیگر سرحدی علاقوں میں ارغونوں کو پہلی شکست دی۔

دولہا دریائے خان اور اس کا لشکر

دولہا دریائے خان، جسے سندھ کی تاریخ میں قومی ہیرو کہا جاتا ہے، 1520ء میں ٹھٹھے کے میدان میں

شاہ بیگ ارغون کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ اس کی شہادت سندھ کی قومی مزاحمت کے لیے سنگ میل ثابت ہوئی۔

سوڈھا قبیلہ

ٹھلٹی کی جنگ میں سوڈھا قبائل نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ تاریخ معصومی میں میر معصوم بکری لکھتا ہے کہ سوڈھوں نے مردانگی کی لازوال مثال قائم کی اور رنمل سوڈھے کے ساتھ بڑی تعداد میں جامِ شہادت نوش کیا۔

سہتا قبیلہ

سہتا قبیلے نے بھی ارغونوں کی حکمرانی تسلیم نہ کی اور سیہون و نواحی علاقوں میں ان کے خلاف صف آرا ہوا۔

دولہا دریائے خان کے فرزند

میاں محمود، موٹڑ خان اور جام سارنگ نے ٹلٹی اور باغبان کے معرکوں میں ارغونوں سے مقابلہ کیا۔

ماچھی قبائل

ماچھی قبائل نے باغبان کے علاقہ میں ارغونوں کے خلاف مزاحمت کی۔

ڈہر، دھریجے اور مہر قبائل

بکر کے قلعہ میں یہ قبائل ارغونوں کے مقابلہ پر آئے۔ دھریجوں نے سلطان محمود ارغون کو گرفتار کرنے کی بھی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔

صوفیانہ اثر رکھنے والی مذہبی قوتیں

مخدوم بلال جیسے صوفی بزرگوں نے بھی ارغونوں کو تسلیم نہ کیا اور عوام کو مزاحمت پر ابھارا۔

ناکامی کی وجوہات

- قبائل کی باہمی نااتفاقی اور بکھری ہوئی جدوجہد۔
- منظم فوجی طاقت کا فقدان۔
- بعض مقامی افراد (جیسے قاضی قادن) کی غداری۔

نتیجہ

شاہ بیگ ارغون کے خلاف سندھ کے قبائل ـ **سمہ، سوڈھا، سہتا، ماچھی، ڈہر، دھریجہ اور مہر** ـ نے جان نثار جدوجہد کی۔ ان کے ساتھ **دولہا دریائی خان، اس کے**

فرزند اور صوفی بزرگ بھی مزاحمت کی علامت بنے۔ اگرچہ یہ جدوجہد مکمل کامیابی حاصل نہ کرسکی، لیکن سندھ کی تاریخ میں یہ دور آزادی کی آرزو اور قومی شعور کی لازوال علامت بن گیا۔

سندھ رانی اور میر باگو خان تالپور:اقتدار، محبت اور قربانی کی انوکھی داستان

رک سندھی

سندھ کی تاریخ صرف سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستان نہیں بلکہ یہ عشق، سیاست اور قربانی کا مرقع بھی ہے۔ انہی قصوں میں سے ایک دلکش اور درد انگیز

کہانی ہے *“سندھ رانی مریم اڈھیجو عرف سونیتا”* اور *میر باگو خان تالپور* کی، جس نے یہ ثابت کیا کہ محبت کی عظمت اقتدار سے کہیں زیادہ ہے۔

سندھ رانی کی پیدائش

سندھ رانی کا اصل نام "مریم" تھا۔ وہ چاکر اڈھیجو کی بیٹی اور سائینڈنو کی بہن تھی۔ ان کا تعلق موجودہ ماتلی تعلقہ کے قریب "ثری" نامی بستی سے تھا۔ مریم 1180ھ کے قریب پیدا ہوئی اور اپنی غیر معمولی حسن و جمال کی وجہ سے "سونیتا" اور بعد میں *سندھ رانی* کہلائی۔

کلہوڑا حکمرانوں کی خواہش

مریم کے حسن کے چرچے سن کر سب سے پہلے کلہوڑا حکمران

میاں سرفراز خان نے اس سے نکاح کی خواہش کی اور منگنی بھی ہوئی، لیکن عمر کم ہونے کے باعث شادی نہ ہوسکی۔ بعد ازاں میاں غلام نبی اور میاں عبدالنبی کلہوڑا بھی اس پر فریفتہ ہوئے۔ لیکن جب ان کے والد چاکر اڈھیجو نے بار بار انکار کیا تو میاں عبدالنبی نے غصے میں آکر اڈھیجا بستی پر حملہ کیا اور 110 بے گناہ افراد کو قتل کر دیا۔

تالپوروں کا عروج

1783ء میں ہالانی کی فیصلہ کن جنگ کے بعد تالپور حکمران بنے تو سندھ رانی ان کے زیر حراست آگئی۔ کئی تالپور امراء اس سے نکاح کے خواہشمند تھے۔ تب فیصلہ ہوا کہ جو شخص اقتدار چھوڑے گا وہ سندھ رانی سے شادی کرے گا۔ میر باگو خان نے

اعلان کیا:

“مجھے حکومت نہیں بلکہ سندھ رانی چاہئے۔”

میر باگو خان اور سندھ رانی کی ازدواجی زندگی

میر فتح علی خان تالپور نے سونیتا کا نکاح میرباگو خان سے کرایا۔ اس کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ میر باگو خان قلیلی ندی پر ایک نہر کھدوائے اور جس زمین کو وہ سیراب کرے گی وہ سندھ رانی کی جاگیر ہوگی۔ میر باگو خان نے حکومت اور دولت چھوڑ کر اپنی محبوبہ کے لئے "باگو واہ" نہر کھدوائی اور "ٹنڈو باگو" شہر آباد کیا، جو آج ضلع بدین کا اہم شہر ہے۔

سندھ رانی کی وفات

1790ء میں سندھ رانی وفات پاگئی۔ وصیت کے مطابق اسے ثری کے قریب سخی سلطان شاہ دیوانو کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

میر باگو خان کا انجام

1804ء میں شکار کے دوران ایک زہریلے سانپ کے ڈسنے سے میر باگو خان کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں وہ "واگھو فقیر" کے نام سے عوام میں مشہور ہوئے اور آج بھی عمرکوٹ میں ان کا مزار زیارت گاہ ہے۔

تجزیہ

یہ کہانی واضح کرتی ہے کہ سندھ کی تاریخ میں محبت، قربانی اور انسانیت کی قدریں اقتدار سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ میر باگو

خان کا اعلان:
“مجھے حکومت نہیں، سندھ رانی چاہئے”
محبت کو تاج و تخت پر فوقیت دینے کی شاندار مثال ہے۔

جب ارغون حکمران کے دو بھائی سندھ کے ہاتھوں مارے گئے

رُک سندھی

سندھ کی تاریخ عروج و زوال، اتحاد و انتشار اور مزاحمت و غلامی کے ادوار سے بھری پڑی ہے۔ انہی میں سے ایک سب سے ہنگامہ خیز دور تھا **ارغون اور ترخان خاندانوں کا عہد**، جو ظلم، داخلی کشمکش اور سیاسی تقسیم کے سبب یاد کیا جاتا ہے۔ مگر اس تاریک زمانے میں بھی سندھ کے قبائل کی مزاحمت نے

ایسے نقوش چھوڑے جو آج بھی تاریخ میں زندہ ہیں۔

سندھ کی تقسیم

یہ موڑ اُس وقت آیا جب **مِرزا شاہ حسن ارغون** 1555ء میں وفات پا گیا۔ اس کی موت کے بعد سندھ دو حصّوں میں بٹ گیا: **ٹھٹہ** پر **مِرزا عیسیٰ ترخان** نے قبضہ جمایا اور **بکّر** پر **سلطان محمود بخاری** نے اپنی حکومت قائم کی۔ یہ تقسیم سندھ کی مسلسل بےچینی اور خانہ جنگی کا آغاز بنی۔

سلطان محمود بخاری اصلاً **ایران کے صوبہ خوزستان** سے تعلق رکھتے تھے۔ جوانی میں وہ **شاہ بیگ ارغون** کی فوج میں شامل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے

گورنر بکّر بنے۔ شاہ حسن کی زندگی میں وہ ارغون خاندان کے وفادار رہے، مگر اس کی موت کے بعد خودمختار حکمران بن بیٹھے۔

ترخانوں سے دشمنی

ٹھٹہ کے عیسیٰ ترخان اور **بکّر کے محمود بخاری** کے درمیان کشمکش اُس پورے عہد کا نمایاں پہلو تھی۔ دونوں کئی بار آمنے سامنے آئے، مگر فیصلہ کن کامیابی کسی کے حصے میں نہ آئی۔ نتیجتاً سندھ ٹکڑوں میں بٹا اور ہمیشہ جنگ کے دہانے پر رہا۔

سندھ کے قبائل کی مزاحمت

ان جھگڑوں کے بیچ اصل شناخت بنی **سندھی قبائل کی مزاحمت** کی۔ **داھَر، ذریجا،**

مچھي اور دیگر قبائل اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے بار بار محمود بخاری کی افواج پر حملے آور ہوئے۔

انہی لڑائیوں میں ایک فیصلہ کن واقعہ پیش آیا جب سندھ نے ایک تاریخی کامیابی حاصل کی:
سلطان محمود کے دو بھائی، بابا احمد اور عبد الفتاح، جنگ میں مارے گئے۔ یہ صرف فوجی کامیابی نہیں بلکہ جبر کے خلاف کاری ضرب تھی، جس نے سندھ کی بہادری اور عزم کو امر کر دیا۔

سلطان محمود کے آخری ایام

اس سنگین نقصان کے باوجود، سلطان محمود بخاری نے بکّر اور مٹھلا پر اپنی گرفت قائم رکھنے کی

کوشش جاری رکھی۔ لیکن اس کی حکومت امن یا خوشحالی کے بجائے **مسلسل جنگوں اور تصادم** سے عبارت رہی۔ بالآخر 30 مئی 1574ء کو 84 برس کی عمر میں اُس کا انتقال ہو گیا۔

تاریخ اُسے کسی انتظامی کارنامے کے لیے نہیں بلکہ اس بات کے لیے یاد کرتی ہے کہ اُس کے دور میں بھی سندھ کے عوام کی مزاحمت ناقابلِ شکست رہی۔ اس دور کی اصل میراث ارغونوں یا ترخانوں کی نہیں بلکہ اُن سندھ کے قبائل کی ہے، جنہوں نے آزادی کی شمع کو بجھنے نہ دیا۔

**راجا پورس نے سکندر مقدونی
کو سندھ سے کس طرح پسپا
ہونے پر مجبور کیا؟**

رُک سندھی

تمہید

سکندر مقدونی دنیا کے اُن فاتحین میں شمار ہوتا ہے جنہیں تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی، لیکن جب وہ سندھ کی وادی میں داخل ہوا تو اُسے ایسی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جس نے اُسے پسپائی پر مجبور کردیا۔ سندھ کے آزادی پسند لوگوں اور راجا پورس جیسے سورماؤں نے ثابت کیا کہ اس سرزمین کو کبھی غلام نہیں بنایا جا سکتا۔

سکندر مقدونی اور اُس کا خوابِ فتوحات

356 قبل مسیح میں مقدونیہ میں پیدا ہونے والا سکندر، والد فلپ

دوم کی وفات (336 ق.م) کے بعد تخت نشین ہوا۔ وہ ارسطو کا شاگرد رہا، مگر اس کا اصل جنون دنیا کو فتح کرنا تھا۔ ایران، شام، مصر اور افغانستان کو زیر کرنے کے بعد وہ سندھ کی طرف بڑھا۔

سندھ کی سیاسی و معاشی اہمیت

قدیم سندھ پانچ بڑی ریاستوں پر مشتمل تھا:

1. اروڑ – راجا موسیکاموس
2. سیوھنڑ – راجا سامبس
3. پٹالا (موجودہ حیدرآباد و لاڑ) – راجا موکرس
4. بیمباکتھ (کراچی و لس بیلا) – اورتان قبیلہ
5. سمانگر (ٹھٹھہ و سجاول) – یادونسی راجا سامبس

سندھ "سونے کا گھر" کہلاتا تھا۔ بھنپور کی بندرگاہ مصر کی اسکندریہ تک تجارت کا ذریعہ تھی۔

راجا پورس اور سکندر کی جنگ

326 ق.م میں سکندر کی فوج کا مقابلہ راجا پورس سے ہوا۔ پورس کے پاس ہزاروں سپاہی، سوار اور 200 جنگی ہاتھی تھے۔ یونانی مؤرخوں کے مطابق پورس کے سپاہی بڑے کمانوں اور لمبے تیروں کے ماہر تھے۔

پلوتارخ لکھتا ہے:

"پورس کے خلاف جنگ میں سکندر کی فوج کا حوصلہ ٹوٹ گیا، یہ

جنگ فتح نہیں بلکہ شکست تھی۔"

آخر کار سکندر نے پورس کو عزت و وقار کے ساتھ راجا تسلیم کیا۔

سندھ کی عوامی مزاحمت

پورس کے بعد بھی سندھ کے عوام نے یونانیوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

- اروڑ میں چھاؤنی جلادی گئی۔
- سیوھڻ میں اعلان ہوا: *"اطاعت سے بہتر ہے جنگ میں مر جانا"*۔
- پٹالا (موجودہ حیدرآباد) میں یونانی فوج کو شہر سے نکال دیا گیا۔
- ٹھٹھہ اور کراچی میں شدید معرکے ہوئے۔

اریان کے مطابق سندھ کے لوگ ہتھیاروں میں کمزور مگر دلیر اور وطن پرست تھے۔

سکندر کی پسپائی

آخر کار عوامی مزاحمت، بیماریوں اور تھکن کے باعث سکندر مزید آگے نہ بڑھ سکا اور مکران کے دشوار راستوں سے ہوتا ہوا واپس بابل پہنچا، جہاں 323 ق.م میں صرف 33 برس کی عمر میں وفات پاگیا۔

ایچ ٹی لیمبرک لکھتا ہے:

"سکندر کی سندھ میں مہم کوئی فتح نہیں بلکہ ایک خون آلود مصیبت تھی۔"

نتیجہ

راجا پورس اور سندھ کے عوام نے ثابت کیا کہ آزادی کو زنجیروں میں جکڑا نہیں جا سکتا۔ یونانی مؤرخین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ سندھ کے لوگ دلیری، بہادری اور حب الوطنی میں بے مثال تھے۔

حوالہ جات

1. Plutarch. *Parallel Lives: The Life of Alexander*. Loeb Classical Library, Harvard University Press.
2. Arrian. *The Anabasis of Alexander*. Translated by Aubrey de Sélincourt. Penguin Classics, 1971.

3. Robin Lane Fox. *Alexander the Great*. Penguin Books, 1973.
4. H. T. Lambrick. *Sindh: A General Introduction*. Oxford University Press, 1973.
5. Herodotus. *Histories*. Translated by A. D. Godley. Loeb Classical Library, Harvard University Press.

پانی کا ہتھیار: دریائے سندھ پر سیاسی انتقام یا تہذیبی قتل؟

خلاصہ
بھارت کی جانب سے دریائے سندھ کا پانی پاکستان کو نہ دینے کی دھمکی سرحدی پانی کی سیاست میں ایک خطرناک مثال ہے۔ یہ مضمون قانونی، ماحولیاتی اور تہذیبی اثرات کا جائزہ لیتا ہے اور دلیل دیتا ہے کہ پانی کو بطور ہتھیار استعمال کرنا خطے کے استحکام، فطرت اور صدیوں پرانی تہذیبوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

تعارف

اپریل 2023 میں بھارت نے سندھ طاس معاہدے کو یکطرفہ طور پر "معطل" کر دیا۔ وزیرِ آبی وسائل چندرکانت پاٹل کا بیان—"دریائے سندھ کا ایک قطرہ بھی پاکستان نہیں جائے گا"—صرف سیاسی اشتعال نہیں بلکہ ایک سنگین بین الاقوامی اور ماحولیاتی خطرہ ہے (Afzal, 2021)۔

قانونی پس منظر

1960ء میں عالمی بینک کی ثالثی سے طے پانے والا سندھ طاس معاہدہ جنوبی ایشیا میں پانی کی تقسیم کا واحد مستند فریم ورک ہے۔ اس کی یکطرفہ معطلی اقوامِ متحدہ کے ویانا کنونشن کی خلاف ورزی ہے، جو کسی فریق کو معاہدہ یکطرفہ طور پر ختم کرنے کی اجازت نہیں دیتا (Ali & Khuhro, 2021)۔

ماحولیاتی اثرات

اگر بھارت نے واقعی دریائے سندھ کا پانی روک دیا تو:

- پاکستان کی زرعی زمینیں بنجر ہو جائیں گی
- سندھ کے دلدلی علاقے اور مینگروو جنگلات ختم ہو جائیں گے
- لاکھوں افراد ماحولیاتی پناہ گزین بن جائیں گے
- زیرِ زمین پانی کی سطح گر جائے گی
- زمین میں نمکیات بڑھ جائیں گے
- دریائی حیات اور ماحولیاتی توازن تباہ ہو جائے گا (Ali & Khuhro, 2021)

تہذیبی ورثہ

دریائے سندھ صرف ایک آبی گزرگاہ نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک کا جنم دینے والا ہے۔ سر جان مارشل اور مارٹمر ویلر نے اسے موریہ سلطنت سے بھی قدیم قرار دیا (Marshall, 1931; Wheeler, 1959)۔ وینڈی ڈونگر کے مطابق، ویدک تہذیب دراصل سندھ تہذیب سے متاثر تھی (Doniger, 2009)۔

دریا بطور زندہ مخلوق

رابرٹ میکفارلین لکھتے ہیں: "اگر ہم دریاؤں کو زندہ مان لیں، تو دنیا کو دیکھنے کا ہمارا زاویہ بدل جاتا ہے۔" (Macfarlane, 2017)۔ مستنصر حسین تارڑ اور جیمز سی اسکاٹ بھی دریاؤں کو تہذیب، ثقافت اور انسانیت کا جزوِ لازم قرار دیتے ہیں (Scott, 2020; Tarar, 2001)۔

نتیجہ

دریائے سندھ امن، تہذیب اور فطرت کا بہاؤ ہے۔ اسے روکنا نہیں، بہنے دینا چاہیے۔ پانی کو جنگ کا ہتھیار نہیں بلکہ اشتراک اور زندگی کا ذریعہ بنانا چاہیے۔

حوالہ جات

Afzal, M. (2021). *Indus Water Treaty Between Pakistan and India of 1960: An analysis of its journey over six decades and the scope for improvements*. MIT OpenCourseWare. https://ocw.mit.edu/courses/11-382-water-diplomacy-spring-2021/1b7baf844e3d5d65b3bb88d603ddcb21_MIT11_382s21_Afzal.pdf

Ali, S., & Khuhro, A. (2021). *Indus Water Treaty: Challenges and Prospects*. Perennial Journal of History, 2(2), 131–148. https://www.researchgate.net/publication/357222367_Indus_Water_Treaty_Challenges_and_Prospects

Doniger, W. (2009). *The Hindus: An Alternative History*. Penguin Books.

Macfarlane, R. (2017). *Is a River Alive?* Emergence Magazine.

Marshall, J. (1931). *Mohenjo-Daro and the Indus Civilization*. Arthur Probsthain.

رُک سندھی کی ایک مختصر پروفائل

رُک سندھی)پیدائش: 5 اگست 1961، گاؤں حامد اُجن، کنڈیارو، ضلع نوشہروفیروز، سندھ) ایک ممتاز مورخ، مصنف، مترجم اور صحافی ہیں۔ انہوں نے جامعہ سندھ، جامشورو سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور 1980 میں صحافت اور تحقیق کا آغاز کیا۔

رُک سندھی کو وادی سندھ کی تہذیب، سندھ کی تاریخ، اور لسانیات پر گہری تحقیق کے لیے جانا جاتا ہے۔ انہوں نے 22 سے زائد کتابیں سندھی زبان میں تصنیف کیں، جن میں *Rise of Indus Civilization*، *Indus Civilization Scholars*، اور *قاضی فیض محمد* شامل ہیں۔

وہ اردو، سندھی اور انگریزی زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں اور سندھ کی قومی تحریک، نسلی شناخت، اور تاریخی بیانیے کی اصلاح کے لیے سرگرم ہیں۔ ان کی تحریریں علمی تحقیق، ثقافتی فخر، اور وحدت کے پیغام سے بھرپور ہوتی ہیں۔

موریا خاندان اور سندھ — تاریخ، ثقافت اور بدھ مت کے اثرات

تعارف

موریا سلطنت کا عروج برصغیر کی سیاسی، مذہبی اور ثقافتی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ چندرگپت موریا سے اشوکا اعظم تک، اس خاندان نے نہ صرف مگدھ پر حکومت کی بلکہ سندھ تک اپنا اثر بڑھایا۔ سندھ کے تاریخی شعور میں موریا دور کو بدھ مت کے فروغ، یونانی اثرات کے خاتمے، اور مقامی اقتدار کے تسلسل کے حوالے سے خاص اہمیت حاصل ہے (Panhwar, 2007)۔

چندرگپت موریا: سلطنت کا بانی

چندرگپت موریا نے ٹیکسیلا میں تعلیم حاصل کی اور 322 قبل مسیح میں نندا خاندان کے خلاف بغاوت کر کے مگدھ پر قبضہ کیا۔ اس کے مشیر چانکیہ، جو سندھ کے حالات سے واقف تھے، نے سلطنت کو مستحکم کرنے میں اہم

کردار ادا کیا (Limbark, 1982)۔

اس کی سلطنت مغرب میں ہرات تک پھیلی ہوئی تھی، اور پاٹلی پترا (موجودہ پٹنہ) دارالحکومت تھا۔ سکندر کی موت کے بعد پیدا ہونے والا سیاسی خلا، یونانی کمانڈروں کی انتشار، اور سندھی قبائل کی بے چینی چندرگپت کے عروج کے لیے سازگار ماحول بن گئے (Panhwar, 2007)۔

یونانی اثرات کا خاتمہ

سکندر کی وفات (323 قبل مسیح) کے بعد یونانی لشکر میں انتشار پیدا ہوا۔ نیارکس بحری راستے سے سندھ سے فرار ہوا، جبکہ فلپس جیسے کمانڈر قتل کر دیے گئے۔ راجہ پورس کی مدد سے چندرگپت نے یونانیوں کو شکست دی اور سیلوکس کے ساتھ صلح کر کے سیاسی اتحاد قائم کیا۔ اس طرح یونانی اور ایرانی اثرات ختم ہوئے اور سندھ موریا سلطنت کا حصہ بن گیا (Limbark, 1982)۔

اشوکا اعظم: بدھ مت کا پرچار

اشوکا، چندرگپت کا پوتا، 273 قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ وہ بدھ مت کا پکا پیروکار تھا۔ اس کے دور میں سلطنت افغانستان، سندھ، سوات اور نیپال تک پھیل گئی۔ اشوکا نے 14 فرمان جاری کیے، جو براہمی اور خروشتی رسم الخط میں لکھے گئے۔ یہ فرمان مختلف مقامات پر نصب کیے گئے، جن میں سے کئی آج بھی موجود ہیں (Panhwar, 2007)۔

اشوکا کے مبلغین میں سے ’اُپ گپت‘ نے سندھ میں طویل عرصہ گزارا۔ اس نے لوگوں کو اخلاقی قانون کی تعلیم دی، اسٹوپے اور خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ اگرچہ اشوکا کا کوئی فرمان سندھ سے نہیں ملا، مگر اس کے مذہبی اثرات واضح طور پر موجود ہیں (Cousens, 1892)۔

سندھ میں بدھ مت کے اثرات

موریا دور میں سندھ بدھ مت کے فروغ کا مرکز بن گیا۔ اشوکا کے مبلغین کی آمد سے مذہبی تعمیرات، اسٹوپے اور خانقاہیں قائم ہوئیں۔ ایم۔ ایچ۔ پنھور کے مطابق، موریا دور میں سندھ کا مقامی اقتدار سندھیوں کے ہاتھ میں رہا، جبکہ گورنر وقتاً فوقتاً مقرر ہوتے رہے (Panhwar, 2007)۔

ہنری کزنس نے اپنی کتاب *سندھ کے قدیم آثار* میں اشوکا دور کی مذہبی تعمیرات کا ذکر کیا ہے۔ مورو شہر، موریا ذات، اور ’چند موریا‘ کا میلہ اس دور کی ثقافتی یادگاریں ہیں (Cousens, 1892)۔

نتیجہ

موریا خاندان کا دور سندھ کی تاریخ میں ایک ایسا باب ہے جو سیاسی آزادی، مذہبی فروغ، اور ثقافتی تبدیلی کی نمائندگی کرتا ہے۔ چندرگپت کے یونانی اثرات کے خاتمے سے لے کر اشوکا کے بدھ مت کے پرچار تک، سندھ نے نہ صرف ان اثرات کو محسوس کیا بلکہ انہیں اپنے تاریخی شعور کا حصہ بنایا۔

حوالہ جات (APA اسٹائل)

- Cousens, H. (1892). *Sindh ke Qadeem Asaar*. Bombay: Archaeological Survey of India.
- Limbark, D. (1982). *Maurya Saltanat aur Sindh par us ke Asraat*. Delhi: Institute of Historical Research.
- Panhwar, M. H. (2007). *Sindh ki Waqiati Lughat*. Hyderabad: Sindhi Adabi Board.

جھم کا شوَ مندر — ایک تاریخی و ثقافتی جائزہ

خلاصہ

جھم کوٹ (ہم کوٹ) کا شوَ مندر سندھ میں قدیم شیوا پرستی کا ایک اہم مرکز ہے، جو سندھ کی تہذیب اور سندھُو سبھیتا سے گہرے طور پر جڑا ہوا ہے۔ یہ مقالہ مندر کی تاریخ، آثارِ قدیمہ کی شہادت اور رسومات کے تسلسل کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔

تعارف

سندھ قدیم زمانے سے مذاہب اور روایات کا مرکز رہا ہے۔ جھم کوٹ کے جنوب مشرقی کنارے پر مرکزی دروازے کے قریب واقع شوَ کا مندر اس تسلسل کی زندہ علامت ہے (Khan, 2007)۔

تاریخی پس منظر

تحفة الکِرام اور دیگر تاریخی کتب کے مطابق، صدیوں سے یہاں شوَ اور لنگ کی پوجا ہوتی رہی ہے (Qureshi, 1992)۔

سندھُو تہذیب سے ملنے والی ایک مہر میں شوَ کو "پشو پتی" یعنی جانوروں کا مالک دکھایا گیا ہے (Marshall, 1931)۔ نندی (بیل) زرعی معیشت کی علامت تھا (Possehl, 2002)، جو اس بات کی دلیل ہے کہ شوَ لنگ کی پوجا سندھُو دور میں بھی موجود تھی۔

جنوبی ایشیا میں شیوا پرستی

رِگ وید میں شوَ دیوتا کا نام نہیں ملتا، مگر ایک "شوَ" قبیلے کا ذکر ضرور ہے جو سندھُو دریا کے آس پاس آباد تھا (Macdonell & Keith, 1912)۔ ماہرین کا خیال ہے کہ شیوا پرستی کی ابتدا سندھ سے ہوئی (Flood, 1996)۔ وقت کے ساتھ شوَ کو خالق، فنا کرنے والا، اور شفا دینے والا تصور کیا گیا (Gonda, 1977)۔

جھم مندر میں رسومات کا تسلسل

شوَ کی پوجا عموماً لنگ اور پاروتی (یونی) کی مشترکہ علامت کے طور پر کی جاتی ہے۔ یہ پوجا آج بھی جھم مندر میں جاری ہے (Sheikh, 2015)۔

مندر سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے، جس کی ساخت نگرپارکر کے جین مندروں سے مشابہت رکھتی ہے۔ مگر جدید دور میں سیمنٹ اور رنگ و روغن کی وجہ سے اس کی اصل شکل متاثر ہوئی ہے (Khan, 2007)۔

مندر میں ایک چھوٹی مورتی، شوَ لنگ، اور 9 انچ لمبی گنیش کی مورتی تھی، جسے بعد میں کنجھر جھیل میں وسایا گیا (Ansari, 2011)۔

جغرافیائی و ثقافتی پس منظر

قدیم دور میں مندر دریا کے کنارے واقع تھا، اور آج بھی کنجھر جھیل کی لہریں اس کی سیڑھیوں کو چھوتی ہیں۔

مندر کے سامنے زائرین کے لیے غسل خانے بنائے گئے ہیں جن میں کاشی کی سلیں نصب ہیں (Sheikh, 2015)۔

نتیجہ

جھم کا شوَ مندر سندھ میں شیوا پرستی کی قدامت اور تسلسل کی اہم علامت ہے، جو سندھُو سبھیتا کو بعد کی ہندو مذہبی روایات سے جوڑتا ہے۔

References:

- Ansari, N. A. (2011). *Archaeology and Cultural Heritage of Sindh*. Karachi: Sindhology Press.
- Flood, G. (1996). *An Introduction to Hinduism*. Cambridge: Cambridge University Press.
- Gonda, J. (1977). *Change and Continuity in Indian Religion*. The Hague: Mouton.
- Khan, A. W. (2007). *Temples of Sindh: A Historical Survey*. Hyderabad: Mehran Publishers.
- Macdonell, A. A., & Keith, A. B. (1912). *Vedic Index of Names and Subjects*. London: John Murray.
- Marshall, J. (1931). *Mohenjo-Daro and the Indus Civilization* (Vols. 1–3). London: Arthur Probsthain.
- Possehl, G. L. (2002). *The Indus Civilization: A Contemporary*

Perspective. Walnut Creek, CA: AltaMira Press.
- Qureshi, H. (1992). *Tuhfat al-Kiram: Historical Traditions of Sindh*. Karachi: Royal Book Company.
- Sheikh, S. (2015). *Sacred Spaces of Sindh: Religion and Architecture*. Islamabad: National Institute of Historical and Cultural Research.

سندھ میں تمر کے جنگلات — حیاتیاتی اور سماجی و معاشی اہمیت

خلاصہ

سندھ کے تمر کے جنگلات ایک اہم حیاتیاتی وسیلہ ہیں جو سمندری حیات کو سہارا دیتے ہیں، ساحلی علاقوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور مقامی لوگوں کے روزگار کا ذریعہ ہیں۔ یہ جنگلات بنیادی طور پر دریائے سندھ کے دونوں کناروں اور سندھو ڈیلٹا میں پائے جاتے ہیں (IUCN,

2009)۔ ان کی اہمیت کے باوجود، انہیں صنعتی آلودگی، جنگلات کی کٹائی، دریائی بہاؤ میں کمی، اور سمندری سطح میں اضافے جیسے سنگین خطرات لاحق ہیں۔ یہ مضمون ان جنگلات کی تاریخی پس منظر، حیاتیاتی کردار، موجودہ خطرات اور تحفظ کے لیے پالیسی سفارشات پر روشنی ڈالتا ہے۔

تعارف

تمر کے جنگلات (مقامی طور پر تمر کے بیال) سندھ کی قدرتی خوبصورتی کا خاص حصہ ہیں، جو خاص طور پر دریائے سندھ کے ڈیلٹا کے علاقے میں واقع ہیں (Memon, 2005)۔ دریائی معدنیات اور سلٹ ان جنگلات کی نشوونما کے لیے اہم ہیں، جو حیاتیاتی تنوع کے لیے مثالی ماحول فراہم کرتے ہیں۔

حیاتیاتی اہمیت

تمر کے جنگلات چھوٹی مچھلیوں، جھینگوں اور کیکڑوں کے لیے قدرتی نرسری کا کام کرتے ہیں (Saifullah, 1997)۔ ان کی جڑوں کا جال زمین کو مضبوط بناتا ہے اور ساحلی کٹاؤ سے بچاتا ہے (Kathiresan & Bingham, 2001)۔ یہ نہ صرف آکسیجن پیدا کرتے ہیں بلکہ کاربن کو جذب کر کے زمینی ماحولیاتی توازن میں اہم کردار ادا کرتے ہیں (Alongi, 2002)۔

تاریخی پس منظر

برطانوی دور کے ریکارڈ کے مطابق، سندھو ڈیلٹا میں کبھی وسیع تمر کے جنگلات موجود تھے، جہاں دریائی بہاؤ کراچی کے قریب سمندر میں گرتا تھا (Harrison, 1947)۔ 1966ء میں پاکستان میں تمر کے جنگلات تقریباً 486,249 ہیکٹر پر محیط تھے، جو زیادہ تر سندھ میں مرکوز تھے (IUCN, 2009)۔

خطرات

- **صنعتی آلودگی:** کراچی کے ساحل پر چمڑے، اسٹیل اور تیل صاف کرنے والے کارخانوں سے خارج ہونے والے زہریلے مادے (کرومیئم، ہائیڈرو کاربن) جنگلات کے لیے تباہ کن ہیں (Qureshi, 2010)۔
- **پانی کی کمی:** کوٹری بیراج سے نیچے پانی کا بہاؤ 1892ء میں 150 ملین ایکڑ فٹ تھا، جو اب کم ہو کر صرف 10 ملین ایکڑ فٹ رہ گیا ہے (IUCN, 2009)۔
- **زیادہ استعمال:** مقامی لوگ ماہانہ تقریباً 173 کلوگرام لکڑی استعمال کرتے ہیں، جو زیادہ تر تمر سے حاصل کی جاتی ہے (Memon, 2005)۔
- **سمندری سطح میں اضافہ:** ماہرین کے مطابق، ٹھٹھہ اور بدین میں روزانہ تقریباً 80 ایکڑ زمین سمندر نگل رہا ہے (IUCN, 2009)۔

سماجی و معاشی اہمیت

یہ جنگلات ماہی گیری کے لیے نرسری فراہم کرتے ہیں، سمندری طوفانوں سے آبادیوں کو بچاتے ہیں، اور مقامی لوگوں کو لکڑی، ایندھن اور کشتی سازی کا سامان مہیا کرتے ہیں (Saifullah, 1997)۔

سفارشات

- بڑے پیمانے پر دوبارہ شجرکاری
- کوٹری بیراج سے نیچے پانی کے بہاؤ کی ضمانت
- صنعتی فضلے کی روک تھام کے لیے پلانٹس
- مقامی افراد کی شمولیت سے جنگلات کا انتظام
- قومی موسمیاتی پالیسی میں تمر کے تحفظ کو شامل کرنا

نتیجہ

سندھ کے تمر کے جنگلات صرف حیاتیاتی اثاثے نہیں بلکہ سمندری طوفانوں کے خلاف قدرتی دفاعی نظام ہیں ان کی تباہی سے نہ صرف حیاتیاتی تنوع بلکہ مقامی معیشت بھی خطرے میں ہے۔ اس لیے فوری اور عملی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

References (APA Style)

- Alongi, D. M. (2002). Present state and future of the world’s mangrove forests. *Environmental Conservation*, 29(3), 331–349.
- Harrison, J. (1947). *The Indus Delta and its evolution*. Bombay: Government of India Press.
- International Union for Conservation of Nature (IUCN). (2009). *Environmental flows in the Indus River system: An assessment*. Karachi: IUCN Pakistan.
- Kathiresan, K., & Bingham, B. L. (2001). Biology of mangroves and mangrove ecosystems. *Advances in Marine Biology*, 40, 81–251.
- Memon, A. A. (2005). Mangroves of Pakistan: Status and management. *Pakistan Journal of Botany*, 37(4), 997–1010.
- Qureshi, M. T. (2010). Industrial pollution and its impact on mangrove ecosystems of Karachi coast. *Journal of Environmental Studies*, 15(2), 55–70.

- Saifullah, S. M. (1997). Management of mangrove forests in Pakistan. *Mangroves and Salt Marshes*, 1(1), 95–104.

صاحب محل — ایک تعمیری اور تاریخی جائزہ

خلاصہ

صاحب محل، جو ٹنڈو باگو (ضلع بدین) میں واقع ہے، ایک شاندار عمارت ہے جو میر خدا بخش ٹالپر نے 1947ء کے قریب اپنی اہلیہ "صاحب خاتون" کی یاد میں تعمیر کروائی۔ یہ محل نہ صرف اپنی تعمیری خوبصورتی کی وجہ سے نمایاں ہے بلکہ اس سے جڑی جاگیردارانہ سماجی حیثیت، گھریلو زندگی اور ثقافتی اقدار بھی اسے اہم بناتی ہیں۔ یہ مقالہ صاحب محل کے تاریخی پس منظر، فنِ تعمیر کی خصوصیات اور موجودہ حالت کا علمی جائزہ پیش کرتا ہے۔

تعارف

سندھ کے تاریخی اور ثقافتی ورثے میں محلات کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ صرف رہائشی جگہیں نہیں بلکہ طاقت، حیثیت اور جمالیاتی ذوق کا اظہار بھی ہیں (Asher, 1992)۔ ٹنڈو باگو کا "صاحب محل" بدین ضلع میں ایک ایسا ورثہ ہے جو اپنی شاندار تعمیر اور سماجی حیثیت کی وجہ سے ممتاز ہے۔

تاریخی پس منظر

میر خدا بخش ٹالپر، ضلع بدین کے ایک بڑے زمیندار تھے، جن کے پاس تقریباً 30,000 ایکڑ زرعی زمین تھی (Shaikh, 2010)۔ وہ "میر لامبٹ" کے نام سے بھی مشہور تھے۔ یہ محل انہوں نے اپنی اہلیہ صاحب خاتون کی یاد میں تعمیر کروایا، جو ان کے دوست بچو خان کورائی کی بیٹی تھیں۔ محل کے اندر ان کی چھوٹی بیٹی کی قبر بھی ہے، جو 1950ء میں بچپن میں وفات پا گئی (Qureshi, 2015)۔

تعمیری خصوصیات

صاحب محل تین منزلوں پر مشتمل ہے، جس کی تعمیر میں اسلامی، مقامی اور نوآبادیاتی فنِ تعمیر کے اثرات نظر آتے ہیں (Khan, 2001)۔

- **گنبد اور چھجّے:** محل کے ہر کونے پر آٹھ پہلو والے گنبد بنے ہوئے ہیں، جبکہ آٹھ جوڑے چھجّے موجود ہیں۔
- **اندرونی حصہ:** رنگین شیشوں والے لکڑی کے دروازے، ٹائلوں سے فرش بندی اور برآمدے محل کے جمالیاتی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔
- **باغ اور تفریح:** محل کے قریب شالیمار باغ کے طرز پر باغ بنایا گیا تھا، جو اب ختم ہو چکا ہے، مگر پانی کا حوض اور تفریحی چھجّے اب بھی موجود ہیں (Memon, 2018)۔
- **تیسری منزل:** اوپری حصے میں منظرگاہ کے طور پر استعمال ہونے والے کمرے اور سرخ چاند-تارے سے مزین چھت شامل ہے۔

سماجی اور ثقافتی اہمیت

محلات سندھ کے جاگیرداروں کی حیثیت، طاقت اور جمالیاتی ذوق کی علامت ہیں (Lari, 1996)۔ صاحب

محل نہ صرف ایک شخصی یادگار ہے بلکہ سندھ کے جاگیردارانہ معاشرے کی گھریلو زندگی، ثقافتی رجحانات اور تاریخی اہمیت کا عکس بھی ہے۔

موجودہ حالت

فی الحال صاحب محل کے مالک میر ابوبکر خان ٹالپر ہیں، جو اپنے خاندان کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہیں۔ عمارت کی ساخت اب بھی قائم ہے، مگر باغ اور کچھ حصے بے توجہی کے باعث ختم ہو چکے ہیں (Sindh Culture Dept., 2020)۔

نتیجہ

صاحب محل سندھ کے جاگیردارانہ معاشرے اور تعمیری ورثے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کو محفوظ رکھنے کے لیے حکومت اور مقامی سطح پر سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس عمارت کی دیکھ بھال نہ صرف مقامی سطح پر بلکہ عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے بھی اہم ہے۔

حوالہ جات (APA اسٹائل)

- Asher, C. B. (1992). *Architecture of Mughal India*. Cambridge University Press.
- Khan, A. N. (2001). *Islamic Architecture in South Asia*. Oxford University Press.
- Lari, Y. (1996). *The Dual City: Karachi During the Raj*. Oxford University Press.
- Memon, A. (2018). *Cultural Heritage of Sindh*. Karachi: Royal Book Company.
- Qureshi, I. (2015). *Sindh: History and Architecture*. Hyderabad: Sindh University Press.

- Shaikh, A. (2010). *Landlords and Power in Sindh*. Karachi: Oxford University Press.
- Sindh Culture Department. (2020). *Heritage Sites of Sindh*. Government of Sindh.

غزالہ رفیق — ریڈیو، ٹی وی، فلم اور اسٹیج کی نامور فنکارہ

خلاصہ

غزالہ رفیق (1939–1977) سندھی اور اردو ادب، موسیقی، ڈراما اور فلم کی دنیا میں ایک نمایاں نام رہی ہیں۔ ان کا فن ریڈیو سے لے کر ٹیلیویژن، اسٹیج اور فلم تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ مقالہ ان کی زندگی، فنی سفر اور خدمات کا علمی جائزہ پیش کرتا ہے۔

تعارف

پاکستان کے فنی اور ادبی میدان میں کئی شخصیات نے اپنا منفرد مقام بنایا، جن میں غزالہ رفیق کا نام نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے فن کے ذریعے سندھی اور اردو زبانوں کے

ڈرامائی اور فنی سرمائے میں اہم کردار ادا کیا (Ansari, 2005)۔

ابتدائی زندگی

غزالہ رفیق 1939ء میں قمبر علی خان، ضلع قمبر شہدادکوٹ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام بلقیس تھا۔ وہ غلام نعمان انصاری کے گھر پیدا ہوئیں، جبکہ ان کے والد عثمان علی انصاری ایک معروف ادیب، دانشور اور محقق تھے (Shaikh, 2010)۔ ادبی ماحول کے اثر سے وہ بچپن ہی سے ادب کی طرف مائل رہیں اور افسانے لکھے، جو اس وقت کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے (Memon, 2014)۔

موسیقی اور ریڈیو پر آغاز

غزالہ رفیق نے موسیقی کی تعلیم استاد امراؤ بندو خان اور ماسٹر محمد ابراہیم سے حاصل کی۔ زیڈ اے بخاری نے انہیں 1957ء میں ریڈیو پر متعارف کروایا، جہاں وہ بلقیس انصاری کے نام سے گانے لگیں (Qureshi, 2016)۔ ان کا پہلا کمپئرنگ پروگرام *لپٹن کی محفل* تھا، جس کے بعد *صبح دم*، *دروازے*، *خاور کھلا*، *صبح نو* اور *اتوار کے اتوار* جیسے پروگرام مشہور ہوئے (Shaikh, 2010)۔

ریڈیو اور ٹیلیویژن پر خدمات

ان کا پہلا ریڈیو ڈراما *آگ* تھا، جسے سید احمد رفعت نے لکھا اور شمس الدین بٹ نے پروڈیوس کیا (Memon, 2014)۔
ٹی وی پر انہیں عبدالکریم بلوچ نے سندھی پروگرام *پارس* میں متعارف کروایا۔
ان کا پہلا ٹی وی ڈراما *مرزا غالب* تھا، جس میں گلوکارہ کا کردار ادا کرنے پر انہیں پی ٹی وی ایوارڈ ملا (Qureshi, 2016)۔

- **اردو ڈرامے:** *آخری موم بتی، پت جھڑ کے بعد، پیرانا، چوتھا اسٹیشن*
- **سندھی ڈرامے:** *عمر ماروی، نوری جام تماچی، سسئی پنہوں، لیلا چنیسر، دوزخ*

فلمی کردار

غزالہ رفیق نے سندھی فلم *رت جا رشتا* میں صداکار قربان جیلانی کی ماں کا کردار ادا کیا، جو ان کا یادگار کردار ثابت ہوا (Ansari, 2005)۔

ذاتی زندگی اور وفات

انہوں نے 1964ء میں چوہدری رفیق سے شادی کی، جن سے ان کے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ وہ 24 جنوری 1977ء کو 38 سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئیں اور انہیں کراچی کے پاپوش نگر قبرستان میں دفن کیا گیا (Shaikh, 2010)۔

نتیجہ

غزالہ رفیق نے کم عمری میں ہی فنی دنیا پر گہرا اثر چھوڑا۔ ریڈیو، ٹیلیویژن، فلم اور اسٹیج میں ان کی خدمات سندھی اور اردو زبانوں کے فنی ورثے کے لیے ایک لازوال سرمایہ ہیں۔

حوالہ جات (APA اسٹائل)

- Ansari, U. A. (2005). *Sindhi Adabi aur Fanni Shakhsiyatain*. Hyderabad: Sindh Adabi Board.
- Memon, A. R. (2014). *Pakistan Television aur Sindhi Drama*. Karachi: Oxford University Press.

- Qureshi, S. (2016). *Radio Pakistan: Tareekh aur Riwayat*. Lahore: Sang-e-Meel Publications.
- Shaikh, H. (2010). *Sindh Ji Adabi Aur Fanni Tareekh*. Jamshoro: University of Sindh Press.

پَبّ پہاڑ: تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی جائزہ

تعارف

پَبّ پہاڑ، ہالار کی جنوبی پہاڑی قطار میں واقع ہے، جو ہاکس بے سے تقریباً گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی ساخت انسانی پاؤں سے مشابہ ہے، اسی وجہ سے اسے ”پَبّ“ کہا جاتا ہے۔ (لغاری، 2007)۔ یہ پہاڑ زیادہ بلند نہیں، اس کی چوٹیاں پانچ سے چھ ہزار فٹ کی ہیں، مگر اس کی گھاٹیاں، چٹانیں اور قدرتی مناظر دیدنی ہیں۔

جغرافیائی خصوصیات

پَبّ پہاڑ میں سات بڑے لَک (گزرگاہیں) ہیں: آمری، پَبّونی، راہگ، شاہ بلاول، گندبو، لونڈکی اور ویرحب۔ ان میں سے تین راستے تاریخی و تجارتی

لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں (بھٹو، 1999)۔
پہاڑ کے بعض حصے سرسبز ہیں، جہاں انجیر، بیر، کھجور اور دیگر پھل اگتے ہیں۔

تاریخی اہمیت

- **بلوچ قبائل:** کسی زمانے میں بلوچ قبائل انہی راستوں سے سندھ پر حملہ آور ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں، دیبل کے ساتھ تجارتی روابط بھی انہی راستوں کے ذریعے قائم تھے (کھٹی، 1982)۔
- **سکندر اعظم (356–323 ق.م):** ہندوستان سے واپسی کے وقت سکندر نے پَبّ پہاڑ عبور کیا۔ اس کے جو فوجی راستے میں مرے، ان کی قبریں اور پتھر کے مینار آج بھی روایت کا حصہ ہیں (الطاف، 1975)۔
- **محمد بن قاسم (695–717ع):** سندھ پر حملے کے دوران اس کی پیادہ فوج بھی پَبّ سے گزری (شیخ، 1990)۔
- **شاہ عبداللطیف بھٹائی (1689–1752ع):** جب وہ ہنگلاج گئے تو پَبّ پہاڑ کو عبور کیا۔ سسی-پنھوں کی داستان سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے رسالے میں پَبّ کا کئی بار ذکر کیا، مثلاً: ”تون جي پھڻ پَبّ جو، ته لِڱ منھنجا لوھه“ (بھٹائی، 1752/2009)۔

ثقافتی و ادبی اہمیت

شاہ لطیف کی شاعری نے پَبّ پہاڑ کو سندھ کے ادبی ورثے میں امر کر دیا۔ سسی کی اپنے محبوب

پنھوں کی تلاش میں پَبّ کے راستوں سے گزرنے کی کہانی سندھ کی لوک روایت اور روحانی جدوجہد کی علامت بن گئی (جمالی، 2011)۔

تجارتی و معاشی کردار

پَبّونی لَک کو ماضی میں ”بلوچستان کا تجارتی راستہ“ کہا جاتا تھا۔ یہاں سے اون، چاول، کپاس، کھجور، شہد اور جانوروں کی کھالیں کراچی کی منڈیوں تک پہنچتی تھیں (سومرو، 1986)۔

سیاحت اور حیاتیاتی تنوع

شاہ بلاول اور گندبو کے راستے آج بھی سیاحوں اور شکاریوں کے لئے پرکشش ہیں۔ چشمے، آبشاریں، وادیاں اور غاریں اس علاقے کو دلکش بناتی ہیں۔ مور، ہرن، چیتے اور ریچھ یہاں پائے جاتے ہیں۔ بارشوں کے موسم میں کھیتیاں شاداب ہوتی ہیں، جو کراچی کی غذائی ضروریات خصوصاً گوشت کی فراہمی میں معاون ہیں (مغیز، 2001)۔

نتیجہ

پَبّ پہاڑ اپنی جغرافیائی حیثیت، تاریخی پس منظر، تجارتی اہمیت اور ادبی مقام کی وجہ سے سندھ کا اہم پہاڑ ہے۔ اگرچہ اس کی پرانی عظمت کم ہو چکی ہے، مگر یہ آج بھی سندھ کے ثقافتی اور تاریخی ورثے کی علامت ہے۔

References

- Altaf, H. (1975). *Ancient history of Sindh*. Karachi: Sindhi Adabi Board.

- Bhitai, S. A. L. (1752/2009). *Shah jo Risalo* [Poetic compendium of Shah Abdul Latif]. Hyderabad: Institute of Sindhology.

- Bhutto, F. (1999). *Mountains and valleys of Sindh*. Sukkur: Mehran Academy.

- Jamali, A. (2011). *Symbolic significance of mountains in Shah Latif and Sindhi literature*. Karachi: University of Sindh Press.

- Khati, N. (1982). *Trade routes of Sindh and Balochistan*. Hyderabad: Sindhi Adabi Board.

- Laghari, M. (2007). *Geography of Sindh*. Karachi: Oxford University Press.
- Mughiz, A. (2001). *Natural resources of Sindh*. Hyderabad: Mehran Publications.
- Shaikh, R. (1990). *Muhammad bin Qasim and the conquest of Sindh*. Karachi: Institute of Sindhology.
- Soomro, H. (1986). *Trade and economy in Sindh*. Sukkur: Sindhi Adabi Sangat.

پتڑ منارو — قدیم سندھ کا تاریخی مقام

تعارف

سندھ کے قدیم آثار میں کئی مقامات تاریخی، مذہبی اور ثقافتی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ایک نمایاں مقام پتڑ منارو ہے، جو رحیم یار خان سے تقریباً پانچ کلومیٹر مشرق

میں سندھ کے خشک بہاؤ کے کنارے واقع ہے۔ اس مقام پر پھیلے ہوئے ٹیلے سندھ کی قدیم تہذیب اور اس کی ارتقائی تاریخ کے گواہ ہیں (Machan, 1870)۔

تاریخی پس منظر

پتڻ منارو کو بدھ مت کی خانقاہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق یہ خانقاہ پانچ میناروں پر مشتمل تھی: درمیان میں ایک بڑا چوکور مینار اور چار چھوٹے مینار اطراف میں۔ وقت کے ساتھ کچھ مینار زمین بوس ہو گئے۔ 1740ء میں بہادر خان ہالاڻي نے مرکزی مینار کو گرایا، جبکہ فضل علی خان ہالاڻي نے باقی میناروں کو منہدم کر کے ان کے پتھر دین گڑھ، صاحب گڑھ اور بھاگلا کے قلعوں کو مضبوط بنانے میں استعمال کیے (Wirya, 1979)۔

آثاریاتی جائزہ

پتڻ منارو کی سطح پر ٹوٹے ہوئے برتن اور اینٹوں کے ٹکڑے ملتے ہیں۔ برسات کے موسم میں تانبے کے سکے اور برتن بھی دریافت ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں باقاعدہ کھدائی نہیں ہوئی، مگر ابتدائی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مقام بڑی اہمیت رکھتا ہے (Machan, 1870)۔

قریبی وابستہ مقامات:

- **بھندار:** تقریباً چار میل دور، جہاں گوداموں کے آثار ملتے ہیں۔
- **کوکھڑ دڑو:** پانچ میل دور، جو اسی شہر کا حصہ رہا ہے۔
- **دروازے کے آثار:** مشرق میں پانچ میل دور، شہر کے داخلی راستے کے نشان۔
- **بند پتڻ:** تین میل دور، جو قیدخانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا (Tod, 1829)۔

تاریخی حوالہ جات

کرنل ٹاڈ نے اپنی کتاب میں پتڑ کو ایک قدیم شہر کے طور پر ذکر کیا ہے، جو بعض حکمرانوں کا دارالحکومت رہا۔ دسویں صدی عیسوی میں سومروں نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا۔ سومروں کے زوال کے بعد کچھ سومرا قبائل بلوچوں میں شامل ہو گئے اور وقت کے ساتھ گورچاٹي کہلانے لگے (Tod, 1829)۔

مذہبی اور ثقافتی اہمیت

کرنل میچن کے مطابق، عمارت سے ایک تحریر ملی جو سندھی یا سرائیکی سے ملتی جلتی زبان میں تھی۔ یہ تحریر 1559ء سے 1569ء کے درمیان کی ہے اور کسی مذہبی شخصیت یا عبادت گاہ کے لیے نذرانے کا ذکر کرتی ہے، جو اس مقام کی روحانی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے (Machan, 1870)۔

نام اور شناخت

پتڑ کو “پتڑپور” بھی کہا جاتا تھا۔ اکبر کے دور کی دستاویزات اس نام کی تصدیق کرتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی تک یہ شہر آباد رہا اور سندھ، بیکانیر اور جیسلمیر کے لوگ “شو راتری” کے میلے پر یہاں آتے تھے (Wirya, 1979)۔

نتیجہ

پتڑ منارو سندھ کے ان قدیم مقامات میں سے ہے جو کثیر جہتی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مقام بدھ مت، سومرا حکمرانی، مغلیہ دور اور علاقائی قبائل کی تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ بدقسمتی سے یہاں اب تک کوئی باقاعدہ آثاریاتی کھدائی نہیں ہوئی، جو مستقبل میں اس مقام کی تاریخی اہمیت کو مزید واضح کر سکتی ہے۔

حوالہ جات (APA اسٹائل)

- Machan, C. (1870). *Archaeological Notes on the Ruins near Rahim Yar Khan*. Bombay: British Archaeological Survey.
- Tod, J. (1829). *Annals and Antiquities of Rajasthan*. London: Smith, Elder & Co.
- Wirya, A. K. (1979, December 30). *Personal Observations of Patan Minara*. Rahim Yar Khan: Unpublished Field Notes.

روھل جی کنڈ — سندھُو تہذیب کا ایک اہم مقام

تعارف

سندھُو تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے، جس کے آثار آج بھی سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں۔ ان میں *روھل جی کنڈ* ایک ایسا اہم مقام ہے جو اپنے جغرافیائی محلِ وقوع، ثقافتی آثار اور تجارتی روابط کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مقام ضلع جامشورو میں نئیں گاج کے پانیاری لک میں واقع ہے اور قدیم آمری ثقافت کا حصہ سمجھا جاتا ہے (Mughal, 1997)۔

جغرافیائی محلِ وقوع

روھل جی کنڈ نئیں گاج کے بائیں کنارے پر واقع ہے، جو کِیرتھر پہاڑوں سے نکل کر سندھ میں داخل ہوتی ہے۔ یہ لک تنگ اور ناہموار ہے، مگر دیگر راستوں کے مقابلے میں زیادہ قدیم اور آباد رہا ہے۔ نئیں گاج ایک بڑا موڑ بھی بناتی ہے، جسے مقامی طور پر *تِک جو کنب* کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ قدرتی حسن سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم انسانی آبادی کے لیے ایک چیلنج بھی رہا ہے (Allchin & Allchin, 1982)۔

ثقافتی اور آثارِ قدیمہ کی اہمیت

اس مقام سے ملنے والے برتن، بیل اور بکریوں کی چھوٹی مورتیاں، اور روزمرہ استعمال کے اوزار آمری ثقافت سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ مقام نہ صرف ایک بستی تھا بلکہ زرعی اور تجارتی مرکز بھی رہا ہے (Possehl, 2002)۔

مقامی نام اور تاریخی شناخت

مقامی لوگ اس مقام کو *لوڑھ* کہتے ہیں، جبکہ آثارِ قدیمہ کی کتابوں میں اسے *روھل جی کنڈ* لکھا گیا ہے۔ یہ نام قدیم روایات، مقامی رسم و رواج اور تاریخی دستاویزات میں مختلف صورتوں میں ملتا ہے (Shaikh, 2004)۔

تجارتی اہمیت

قدیم دور میں روھل لک ایک اہم تجارتی راستہ تھا، جس کے ذریعے قافلے سندھ سے بلوچستان کے اہم شہروں جیسے وَدِ اور نال تک سفر کرتے تھے۔ اس راستے پر موجود آثار سے ملنے والی مٹی کی اشیاء کو *آمری-نال تہذیبی ورثہ* کہا جاتا ہے، جو سندھ اور بلوچستان کے درمیان ثقافتی اور تجارتی روابط کا ثبوت ہیں (Jarrige, 1991)۔

جغرافیائی چیلنجز

برسات کے موسم میں نئیں گاج کا بہاؤ انتہائی تیز اور خطرناک ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس راستے پر آمد و رفت مکمل طور پر بند ہو جاتی تھی۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ قدیم باشندوں کو قدرتی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ کس طرح اپنی بستی کو قائم رکھتے تھے (Wright, 2010)۔

نتیجہ

روھل جی کنڈ سندھُو تہذیب کا ایک منفرد اور اہم مقام ہے، جو اپنے جغرافیائی محلِ وقوع، آثار اور تجارتی روابط کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مقام نہ صرف آمری ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ سندھ اور بلوچستان کے درمیان قدیم تجارتی اور ثقافتی روابط کا ثبوت بھی ہے۔ اس کی مزید تحقیق سے سندھُو تہذیب کے ابتدائی مراحل کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

حوالہ جات (APA اسٹائل)

- Allchin, B., & Allchin, R. (1982). *The Rise of Civilization in India and Pakistan*. Cambridge University Press.
- Jarrige, J. F. (1991). *Mehrgarh: Field Reports 1974–1985*. French Archaeological Mission.
- Mughal, M. R. (1997). *Ancient Cholistan: Archaeology and Architecture*. Ferozsons.
- Possehl, G. L. (2002). *The Indus Civilization: A Contemporary Perspective*. AltaMira Press.
- Shaikh, A. (2004). *Archaeology of Sindh*. Institute of Sindhology.

- Wright, R. P. (2010). *The Ancient Indus: Urbanism, Economy, and Society*. Cambridge University Press.

تیرتھ دھارا — ایک علمی جائزہ

تعارف

سندھ اپنے قدیم آثار، مذہبی مقامات اور قدرتی ماحول کی وجہ سے ہمیشہ سے علمی اور ثقافتی مطالعے کا مرکز رہا ہے۔ ان تاریخی مقامات میں سے ایک *تیرتھ دھارا* ہے، جو لکی (ضلع جامشورو) میں واقع ہے۔ یہ مقام گرم چشموں، قدیم شوالوں، غاروں اور دیومالائی روایات کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ جگہ نہ صرف ہندوؤں کے لیے مقدس رہی ہے بلکہ مقامی مسلمانوں کی روایات میں بھی اس کی اہمیت موجود ہے (Khatri, 1938)۔

تاریخی پس منظر

تیرتھ دھارا، لکی شاہ صدر ریلوے اسٹیشن سے تقریباً اڑھائی کلومیٹر مغرب میں پہاڑوں کے درمیان ایک وادی نما لک میں واقع ہے۔ یہاں دو گرم پانی کے چشمے قدیم زمانے سے پھوٹتے ہیں، جن کا ذکر تاریخی ماخذوں میں ملتا ہے (Dani, 1992)۔ تقسیم سے پہلے یہاں *شو راتری* کے موقع پر بڑا میلہ لگتا تھا، جس میں سندھ اور بھارت سے ہزاروں یاتری شریک ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود مقامی لوگ، خاص طور پر کوڑھ اور جلدی بیماریوں میں مبتلا افراد، علاج کے لیے یہاں گرم پانی میں غسل کرتے ہیں (Zaidi, 2005)۔ اس کے علاوہ یہاں موجود غار بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، جو انسانی ہاتھوں سے بنایا گیا ہے۔ اس کی ساخت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف رہائش بلکہ عبادت اور چلہ کشی کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے (Khan, 2017)۔

مذہبی اہمیت

ہندو دھرم میں تیرتھ دھارا کو بہت مقدس مقام سمجھا جاتا ہے۔ رامچند کتری اپنی کتاب *شری ہنگلاج جی یاترا* میں ذکر کرتے ہیں کہ یہاں شیو مہادیو اور دکشا پرجا پتی کے درمیان ایک بڑی جنگ ہوئی تھی، جس میں شیو کی بیوی "اوما" ہلاک ہو گئی تھی (Khatri, 1938)۔ شیو کے غم اور غصے کے باعث اوما دیوی کا جسم زمین پر بکھر گیا، اور مختلف مقامات پر شکتی پوجا شروع ہوئی، جن میں سے ایک مقام تیرتھ دھارا بھی ہے۔

اسی وقت، مقامی مسلمانوں میں ایک روایت عام ہے کہ یہ گرم چشمے حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ صدر لکی کی چلہ کشی کا ذکر بھی ملتا ہے (Qasmi, 2010)۔ اس طرح، تیرتھ دھارا دونوں مذاہب میں اہمیت رکھنے والا بین المذاہب ورثہ بن چکا ہے۔

جغرافیائی اہمیت

تیرتھ دھارا کے گرم چشمے جغرافیائی اور سائنسی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں پانی کا درجہ حرارت 102 سے 112 فارنہائیٹ تک ہوتا ہے، جو طبی لحاظ سے جلد اور دیگر بیماریوں کے علاج کے لیے مفید ہے (Khan, 2017)۔ تاہم، گندھک کی زیادتی کی وجہ سے یہ پانی پینے کے قابل نہیں ہوتا، اس لیے مقامی لوگ پینے کے لیے باہر سے پانی لاتے ہیں۔
اسی وقت یہاں کا غار بھی انسانی تاریخ کی ارتقا کو سمجھنے کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ غار زمین کے اندر کھودا گیا ہے، جس کی فنی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم انسان انجینئرنگ اور رہائشی حکمت عملی میں ماہر تھا (Dani, 1992)۔ اس قسم کے مقامات سندھ کی تہذیب اور ماحولیاتی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اہم ہیں۔

نتیجہ

تیرتھ دھارا ایک ایسا مقام ہے جو تاریخ، مذہب اور فطرت کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں موجود گرم چشمے، شوالا، غار اور دیومالائی روایات اس مقام کو نہ صرف مذہبی عقائد بلکہ علمی اور سائنسی تحقیق کے نقطہ نظر سے بھی خاص بناتے ہیں۔ اس جگہ کی تحقیق سے سندھ کے مذہبی تنوع، تہذیب اور قدرتی ورثہ کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے (Zaidi, 2005; Qasmi, 2010)۔

References (APA Style)

- Dani, A. H. (1992). *History of Sindh: Archaeological Perspective*. Karachi: Institute of Sindhology.
- Khatri, R. (1938). *Shri Hinglaj Ji Yatra*. Bombay: Hindu Sahitya Mandal.

- Khan, F. (2017). Geological study of hot springs in Sindh. *Journal of South Asian Studies*, 32(2), 145–162.
- Qasmi, A. U. (2010). *Interfaith Spaces in Sindh: Historical and Cultural Dimensions*. Lahore: Sang-e-Meel Publications.
- Zaidi, S. A. (2005). *Sacred Spaces and Pilgrimage Traditions in South Asia*. New Delhi: Oxford University Press.

علاءالدین خلجی کے سندھ پر حملے کا دعویٰ: تاریخی حقیقت اور لوک شعور کا تجزیہ

رُک سندھی

تعارف

سندھ کے تاریخی شعور میں دودو سومرو کی داستان کو قومی علامت کی حیثیت حاصل ہے، جس میں علاءالدین خلجی کے سندھ پر حملے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دعویٰ لوک قصوں میں تو موجود ہے، لیکن تاریخی حوالوں میں اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں ملتا۔ یہ مضمون اس تضاد کا تجزیہ کرتا ہے کہ کس طرح لوک روایتوں میں علاءالدین خلجی کو سندھ کے سورما دودو سومرو کا مخالف دکھایا

گیا ہے، جبکہ تاریخی دستاویزات میں ایسے کسی حملے کا ذکر نہیں ملتا (Naz, 2014)۔

علاءالدین خلجی کی تاریخی فتوحات

علاءالدین خلجی (1296–1316ء) دہلی سلطنت کا دوسرا سلطان تھا، جس نے دیوگیری، گجرات، چتوڑ، مالوہ، ورنگل اور مدورائی جیسے علاقوں پر فوجی حملے کیے (Rahman, n.d.; History Marg, 2023)۔ ان حملوں کی تفصیل امیر خسرو، ضیاءالدین برنی، اور اسامی جیسے مؤرخین کی کتابوں میں موجود ہے، لیکن ان میں سندھ پر حملے کا کوئی ذکر نہیں ملتا (Jackson, 2003)۔

سیوستان کی جنگ (1298ء): ایک دفاعی کارروائی

1298ء میں سیوستان (موجودہ سندھ) پر منگولوں کے حملے کے دوران علاءالدین خلجی کے جنرل ظفر خان نے منگولوں کو شکست دی۔ یہ جنگ دفاعی نوعیت کی تھی، نہ کہ سندھ پر خلجی کی جارحیت (Wikipedia, n.d.)۔ کچھ حوالوں میں چنیسر کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے، جو دہلی سے وابستہ شخصیت تھی (Jackson, 2003)۔

دودو چنیسر کی کہانی اور لوک شعور

سندھی لوک ادب میں دودو چنیسر کی کہانی ایک بہادر بادشاہ کی قربانی کا قصہ ہے، جس میں چنیسر اپنے بھائی دودو سے تخت چھیننے کے لیے دہلی کے سلطان کو سندھ پر حملے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ یہ قصہ "ڳاهه" کی صنف میں محفوظ ہے، اور اس میں دودو کی شہادت، باگھی بائی کی حکمت، اور جام ابڑو کی جانب سے سندھ کی عورتوں کو "سام" دینے جیسے اخلاقی اقدار بیان کیے گئے ہیں (Doctor, 1985; Sindhi Wikipedia, n.d.)۔

تاریخی مغالطے اور ترمشیرین سے ممکنہ ربط

کچھ محققین کا خیال ہے کہ سندھ کی روایتوں میں مذکور "علاءالدین" دراصل ترمشیرین خان ہو سکتا ہے، جو چغتائی سلطنت کا حکمران تھا اور 1327ء کے قریب ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اسلام قبول کر کے "علاءالدین" کا لقب اختیار کیا، اور ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں اس کا ذکر ملتا ہے (Jackson, 2003)۔ تاہم، ترمشیرین کے حملے دودو سومرو کی شہادت (1300ء) کے بعد ہوئے، اس لیے یہ شناخت تاریخی طور پر درست نہیں لگتی۔

تاریخی خاموشی اور لوک یادداشت

امیر خسرو کی "خزائن الفتوح"، ضیاءالدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی"، اور اسامی کی "فتوح السلاطین" جیسے بنیادی ماخذوں میں علاءالدین خلجی کے سندھ پر حملے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سومرا خاندان کی حکومت کے درست تاریخی تسلسل کی کمی اس معاملے کو مزید پیچیدہ بناتی ہے۔ اگرچہ لوک ادب میں دہلی کے کسی حکمران کے سندھ پر حملے کا ذکر موجود ہے، لیکن اس کی درست تاریخ اور شناخت آج بھی غیر واضح ہے۔ دودو سومرو کی شہادت، باگھی بائی کا کردار، اور کچ کے حکمرانوں کی جانب سے سندھ کی عورتوں کو پناہ دینا محض خیالی قصے نہیں بلکہ تحقیق طلب حقیقت ہیں۔

نتیجہ

اگرچہ علاءالدین خلجی کے سندھ پر حملے کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں، لیکن لوک ادب میں اس کا ذکر سندھ کے قومی شعور، حب الوطنی، اور اخلاقی اقدار کی ترجمانی کرتا ہے۔ تاریخی حقائق کی تلاش کے ساتھ ساتھ لوک روایتوں کی علامتی اہمیت کو سمجھنا بھی ضروری

ہے، کیونکہ یہ قوموں کی جذباتی شناخت اور اجتماعی
یادداشت کا حصہ ہوتی ہیں۔

References:

Doctor, R. (1985). *Sindhi folklore: An introductory survey*. Folklore, 96(2), 223–235. https://www.jstor.org/stable/1259943

History Marg. (2023). *Alauddin Khalji (A.D. 1296–1316)*. Retrieved September 3, 2025, from https://www.historymarg.com

Jackson, P. (2003). *The Delhi Sultanate: A Political and Military History*. Cambridge University Press.

Naz, H. (2014). *Significance of folklore as a source of history and culture: A critical appraisal with special reference to the folklore of Sindh (Pakistan)*. Retrieved from https://www.academia.edu

Rahman, M. (n.d.). *History and biography of Alauddin Khilji*. Retrieved from https://www.academia.edu

Sindhi Wikipedia. (n.d.). *Dodo Soomro*. Retrieved September 3, 2025, from https://sd.wikipedia.org/wiki/دودو_سومرو

Wikipedia. (n.d.). *Mongol invasion of Sindh*. Retrieved September 3, 2025, from

https://en.wikipedia.org/wiki/Mongol_invasion_of_Sindh